فیض
احمد
فیض
اور اس کی
شاعری
شکیل الرحمن

گذشتہ ۲۵ برس میں اردو شاعری کی صنفِ نظم
کو جو نکھار ملا ہے اس کی سجاوٹ میں ترقی پسند شعراء
کی صف پیش نظر ہے اور اس صف میں سب سے آگے
فیض احمد فیضؔ نظر آتے ہیں۔

اردو نظم میں جذبات کو محبوب کا مخاطب
بنا کر پیش کرنا کچھ انھیں کا حصّہ ہے۔ چند اشعار اور
مصرعے زبان زدِ خاص و عام ہو کر محاورے کا
درجہ حاصل کر چکے ہیں۔ مثلاً:

ویراں ہے میکدہ، خم و ساغر اداس ہیں
تم کیا گئے کہ روٹھ گئے دن بہار کے

اس عظیم شاعر کی شاعری کا تجزیہ ہندوستان
کے مقبول تنقید نگار ڈاکٹر شکیل الرحمٰن کے
قلم سے ملاحظہ فرمایئے۔

اُردو اور ہندی میں ایک ساتھ شائع ہونے والی پہلی پاکٹ سیریز

فیض احمد فیض
اور
اُس کی
شاعری
شکیل الرحمٰن

ناشر : سٹار پبلیکیشنز
دریا گنج ، دہلی ۶

قیمت : ایک روپیہ صرف

سول ایجنٹس : پنجابی پستک بھنڈار
دریبہ کلاں ، دہلی ۶

طابع : اردو [illegible] محبوب المطابع برقی پریس [illegible] دہلی ۶ :-

FAIZ KI SHAIRI : Rs 1-00

عصمت تمہارے نام ۔

وہ لمحے کتنے عجیب تھے جب ہم دونوں
مل کر فیض کی وہ نظم گنگناتے تھے ۔
"ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے"
اور جب نظم ختم ہو جاتی تھی تو ہم دونوں جانے
کیا سوچتے رہتے تھے ۔ تم پوچھتی تھیں "تم اداس
کیوں ہو گئے" اور میں تمہاری آنکھوں میں
ایک عجیب چمک دیکھتا تھا ۔

شکیل

فیض احمد فیض کی شاعری میں اس عہد کا باطنی اضطراب ملتا ہے اور اس
اضطراب نے اس شاعری کے ذریعہ ایک المیہ کردار دیا ہے۔

یہ المیہ کردار اس عہد کے انتشار کی علامت ہے۔ فیض کی شاعری میں یہ
اضطراب اور یہ المیہ کردار شعری اور تخیلی فکر اور حسّی تصویرات میں نمایاں ہو
عمدہ شاعری جذبۂ غم کے بغیر پیدا نہیں ہوتی۔ فیض کے کلام میں جذبۂ غم
گہرا اور شدید جذبہ ہے۔ اسی جذبے سے المیات کا تصور ابھرتا ہے۔ "نقش
"دستِ صبا" "زنداں نامہ" اور "دستِ تہِ سنگ" میں المیہ فضا ملتی ہے۔

یہ شاعری کشمکش اور تصادم کی پیداوار ہے۔ جس طرح المیہ ہیرو اذیت اور
کا شکار ہوتا ہے، اسی طرح شاعر بھی اذیت اور کشمکش کا شکار ہے۔ اس پورے
کی اذیت اس کی ذات بن گئی ہے۔ شاعر کی انفرادیت المیات میں ابھرتی ہے۔
انفرادیت ایک مرکز ہے جہاں اس عہد کے اضطراب اور انتشار کی ہر لہر پہنچتی
فیض کی شاعری میں فرد اور عہد کے المیہ کا حسن ملتا ہے اور المیہ کا یہی حسن ان
شاعری کی سب سے اہم قدر ہے۔

جمالیاتی اور رومانی رجحان نے اس حسن کی تلاش میں جانے کہاں کہاں کیا
ہے۔ شاعر ایک مکمل المیہ کردار نظر آتا ہے۔ المیہ ہیرو کی پہچان یہ ہے کہ حسرتِ
اس کا سب سے بڑا درد بن جاتا ہے اور اسی درد کو لئے وہ جد وجہد کرتا ہے۔

سے لڑتا ہے، بُتوں کو توڑتا ہے، ذہنی کشمکش کا شکار ہوتا ہے، مستقبل کے بارے میں طرح طرح سے سوچتا ہے، اپنی انفرادیت پر سب سے زیادہ بھروسہ کرتا ہے اور داخلی طور پر بار بار شکست کھانے پر بھی شکست قبول نہیں کرتا۔ اس کی آرزو مندی اسے بار بار نئی زندگی دیتی ہے، وہ خود اپنا ہمدرد بن جاتا ہے۔ ٹکرانے میں اسے لذت ملتی ہے، زخموں کی ٹیس اسے لذت بخشتی ہے۔ حسرتِ تعمیر کے درد کے ساتھ وہ داخلی طور پر اپنے اوپر سب سے زیادہ بھروسہ کرتا ہے۔ یہی درد فیضؔ کا بھی ہے۔ ان کی شاعری میں جو المیہ کردار ملتا ہے وہ اسی درد سے پہچانا جاتا ہے۔ اس عہد میں اس درد کی لذّت سے کون آشنا نہیں ہے۔

فیضؔ کے پورے المیہ عمل میں صرف سسکتی ہوئی زندگی ظاہر نہیں ہوتی ہے بلکہ آرزو مندی اور لذت اندوزی نے بہت کچھ حاصل بھی کیا ہے۔ ایک المیہ ہیرو اذیت اور تکلیف، کشمکش اور تصادم، ذہنی انتشار اور الجھن، میں بہت کچھ حاصل بھی کرتا ہے۔ "پرومیتھیس باؤنڈ" کی مثال سامنے ہے۔ فیضؔ نے اپنی شاعری سے مستقبل کا ایک دلفریب "الیوژن" پیدا کیا ہے۔ رزمانی فکر سے تقدیر کے خدوخال کو دیکھا ہے، رزمانی اندازِ فکر نے تقدیر کے بُت کو اپنے طور پر توڑا ہے۔ یقیناً یہ شاعری بہت اہم ہے جس نے مبکانکی زندگی کو ایک بھرپور علامتی جواب دیا ہے۔

•

فیض کے کلام میں المیہ کی تعریف بھی ملتی ہے اور وہ یہ کہ حال کے درد و غم کو شدت سے محسوس کرتے ہوئے مستقبل کو حال میں محسوس بھی کیا جائے، اس سے تخیلی فکر اور رومانی اندازِ فکر کی ہمہ گیری کا گہرا احساس ہوتا ہے۔ اس تخیلی فکر اور رومانی انداز نے انتشار، تحیر، الجھن اور سسپنس کو نہایت ہی فنکارانہ انداز میں پیش کیا ہے۔ اس سلسلہ میں کسی لمحہ فیض کی آرزو مندی کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے اسی آرزو مندی نے اندرونی ویرانی کے احساس کو جذبات اور احساسات سے ہم آہنگ کیا ہے کچھ اس طرح کہ خود اپنی اندرونی ویرانی کا احساس بڑھ جاتا ہے۔ انانیت کی شکست بھی متاثر کرتی ہے اور مستقبل کا "ایبورشن" بھی متاثر کرتا ہے اس طرح جمالیاتی شعور کو آسودگی ملتی ہے۔

فیض احمد فیض کو تمام اخلاقی قدروں کا گہرا احساس ہے لیکن ان کی شاعری کا المیہ کردار اپنے جمالیاتی معیار ہی کو سب کچھ سمجھتا ہے۔ جذبہ اور وجدان، داخلیت اور خود مرکزیت ہی کی اہمیت سب سے زیادہ ہے۔ ان کے رومانی اور جمالیاتی رجحان کی پہچان ان ہی باتوں سے ہوتی ہے۔ فیض کی پوری شاعری میں اس عہد کے میکانکی اصولوں اور آدمی کی فطرت کی کشمکش ملتی ہے۔ داخلی اور خارجی کشمکش میں شاعری کی انفرادیت کی بھی پہچان ملتی ہے اور اس تصادم میں وہ المیہ کردار بھی ابھرتا ہے جس کے کچھ دلفریب خواب ہیں اور جو اپنے عہد کی اذیت کو اپنی ذات کی

اذیت پسند انسان خوابوں کی خوبصورت تعبیروں کو پاتا اور ان خوابوں کو حقیقتوں میں تبدیل کرنا چاہتا ہے۔ یہ آرزو مندی اتفاقی چیز نہیں ہے فنکار کا مزاج اور اس کا رجحان اور شاعری کی بہت سی پختہ، تابناک اور روشن روایات اس کے پیچھے ہیں قدروں کی پہچان میں ان روایات نے بڑی مدد کی ہے۔ فیض نے قدروں کے تصادم کا گہرا احساس دلایا ہے۔ اس تصادم کا احساس دلاتے ہوئے وہ خود ذہنی اور جذباتی کشمکش کے شکار ہوئے ہیں۔ ان کی کمزوریاں ظاہر ہوتی ہیں، ہمیں ان کی کمزوریوں سے جذباتی ہمدردی ہو جاتی ہے۔

فیض کو اپنے انداز فکر اور اپنے رجحان پر وہی اعتماد ہے جو یونانی ڈراموں کے المیہ کرداروں کو داخلی طور پر خود اپنے اوپر تھا۔ حالات اور ذہن کے تصادم میں غم نوشی اور آرزومندی کے ساتھ فیض کی شاعری آگے بڑھتی ہے۔ پوری شاعری میں ایک متحرک قوت کا احساس ہوتا ہے۔ اس شاعری کا المیہ کردار بظاہر تنہا نظر آتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہم سب ضمنی کرداروں کی طرح اس کردار سے وابستہ ہو جاتے ہیں۔

المیہ کردار میں جب تک کچھ کمی نہ ہو، ہم اسے المیہ کردار نہیں کہہ سکتے۔ ہر کردار ہر لحاظ سے مکمل نہیں ہوتا۔ کہیں نہ کہیں کچھ کمی ہوتی ہے۔ کچھ جذباتی اور نفسیاتی کمزوریاں ہوتی ہیں۔ یہ کمزوریاں بہت اہم ہوتی ہیں۔ ان ہی سے جذباتی رجحان اور خارجی قدروں کے تضاد کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ فیض کی شاعری کا المیہ کردار اپنی جذباتی اور نفسیاتی کمزوریوں سے بھی پہچانا جاتا ہے۔ ہم ان کمزوریوں سے ہمدردی کرنے لگتے ہیں۔ اندیشے بھی پیدا ہوتے ہیں، پراسرار اندیشے ـــــ یہی فیض کی المناک شاعری کا داخلی ردعمل ہے۔ فیض کا جذباتی رجحان بہت شدت سے متاثر کرتا ہے۔ اس لئے کہ اسی رجحان سے

جذبات اور خارجی قدروں کی کشمکش کا احساس ہوتا ہے اور اس تضاد پر نظر جاتی ہے جس سے المیہ پیدا ہوتا ہے۔ شاعر کے جمالیاتی شعور اور پختہ رومانی فکر سے جمالیاتی مسرت حاصل ہوتی ہے۔ المیہ سے جب تک جمالیاتی آسودگی نہ ملے اس وقت تک المیہ کی اہمیت نہیں ہوتی۔ اس شاعری کا کردار اخلاقیات سے نہیں ابھرتا، وہ کچھ اخلاقی اصول اور عقائد لے کر نہیں آتا، وہ جذبات کا پیکر ہے۔ وہ اپنے حسیاتی، جذباتی اور جمالیاتی کیفیتوں سے پہچانا جاتا ہے۔ اس کا داخلی عمل اور ردِ عمل قابلِ توجہ ہے۔

فیضؔ کی شاعری میں جذباتی زندگی پھیلی ہوئی ہے۔ اس کی بہت سی تہیں ملتی ہیں۔ مخصوص سیاسی اور اخلاقی نقطۂ نظر سے جب کوئی کاروباری ناقد فیضؔ کے کلام کا مطالعہ کرتا ہے تو وہ سیاسی اور اخلاقی نکات تلاش کرتا ہے اور جب اسے مخصوص سیاسی اور اخلاقی نکات نہیں ملتے تو وہ انجماد اور فکر میں جمود کی باتیں کرتا ہے۔ فیضؔ بھی ایسی تنقید سے متاثر ہوئے ہیں اور انہوں نے "نکات" کی پیش کش میں داخلی اور باطنی کیفیتوں کو پس پردہ ڈال دیا ہے، ایسے موقعوں پر ان کی شاعری سطحی اور سپاٹ تجربوں کو پیش کرنے لگی ہے اور وہ المیہ کردار روپوش ہو گیا ہے جو اپنے تہہ دار اور الجھے ہوئے ڈرامائی عمل سے پہچانا جاتا ہے۔ فیضؔ کی کئی نظمیں ایسی ہیں جن کے آخری حصوں میں سپاٹ تجربے ہیں۔ شاعر کا اپنا لہجہ بھی نہیں ہے۔

تخلیقی اور تخیلی فکر اور شعری تجربہ میکانکی اور ٹھوس خارجی تجربوں سے مختلف ہوتا ہے۔ آرٹ میں علامتی فکر ہوتی ہے۔ المیہ، میکانکی فکر سے زیادہ ایک آرٹ ہے۔ فیض اپنے المیہ کردار اچھی طرح پہچانتے ہیں لیکن اس کے باوجود وہ شاعری کے "بین الاقوامی معیار" کی طرف لپکتے ہیں۔ جب تک یہ المیہ کردار ان کی شاعری میں موجود رہے، اپنی "بین الاقوامی دلچسپی" کے باوجود وہ اس معیار تک نہیں جا سکتے، اور اسی میں ان کی سلامتی ہے۔ "نقالی" (IMITATION) کا تصور ہمارے ذہن میں واضح نہیں ہے۔ ارسطو کی 'نقالی' کی اصطلاح خالص جمالیاتی اصطلاح ہے۔ یہ ایک تخیلی عمل ہے جسے ارسطو نے "نقالی کا عمل" کہا ہے۔ فن میں قدر کی نئی تشکیل ہوتی ہے، ہم اسی کو علامتی تشکیل کہتے ہیں۔ 'نقالی' کا تصور تخلیقی شعور سے وابستہ ہے۔ شاعری تاریخ کے مقابلے میں اگر زیادہ گہرا اور بلیغ عمل ہے تو اس کی وجہ یہی ہے۔ ترقی پسند ادب میں ادب فوٹوگرافی کا آرٹ بن گیا ہے، عکاسی اور نقالی کی اصطلاحوں سے یہ سمجھا گیا کہ زندگی جیسی ہے اسی طرح پیش ہو بڑے فنکاروں کی ادبی تخلیقات کو بھی اسی طرح دیکھا گیا۔ حقیقت نگاری کی اصطلاح بری طرح مسخ ہو گئی۔ شاعری جب تک خود ایک داخلی عمل نہ بن جائے اس کی اہمیت نہیں ہوتی۔ فکر و احساس کا داخلی عمل ہی سب کچھ ہے۔ شاعری کا کردار جتنا بھی فلسفیانہ ہو، وہ فلسفہ نہیں بنتی، شاعر کا بنیادی رجحان اور وہ

لمحے جن میں تجربے حاصل ہوتے ہیں، وہی آرٹ کو تابندہ اور ابدی بناتے ہیں۔
جہاں تک شاعری اور آرٹ کے مجموعی تاثرات کا تعلق ہے، ان میں اخلاق، مذہب، فلسفہ، عقاید سب شامل ہیں لیکن شاعری اور آرٹ ان صداقتوں کو سپاٹ طریقے سے پیش نہیں کرتا۔ تخیلی فکر سے تراشے ہوئے کرداروں کی پہچان مخصوص اخلاقی، مذہبی اور فلسفیانہ نقطۂ نظر سے نہیں ہوگی۔ جمالیاتی اور رومانی رجحان کا رشتہ پلاٹ سے ان سے گہرا ہے لیکن یہ عناصر فن و ادب میں جمالیاتی اور رومانی بن جاتے ہیں۔ خارجی قدروں کا داخلیت میں جذب ہو کر ایک داخلی زندگی حاصل کرنا ضروری ہوتا ہے۔

ادب فکر کی ترجمانی کرتا ہے، جذباتی تجربوں میں تخلیقی جذبہ موجود ہوتا ہے یہ درست ہے کہ ادبی قدریں زندگی کی قدروں سے علیحدہ نہیں ہوتیں لیکن زندگی کی علامتیں اور قدریں فن و ادب میں اپنے گریز کے عمل سے پہچانی جاتی ہیں۔ ادبی قدروں کو داخلی اور باطنی قدروں سے تعبیر کرنا چاہیے۔ وہ داخلی قدریں جو شخصیت کو استوار کرتی ہیں اور حقائق زندگی اور شخصیت کو پُرمعانی بناتی ہیں۔ ادب کا کردار اپنی رومانی اور طلسمی دنیا میں پہچانا جاتا ہے۔ جمالیاتی تجربوں کے التباس اور الیوژن میں خارجی تجربوں اور قدروں کی پہچان ہوتی ہے لیکن یہ پہچان ہی سب کچھ نہیں ہے، ادبی اور جمالیاتی تجربہ کی اپنی انفرادیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اور اس کے حقائق پُرمعانی بنتے ہیں۔ زندگی کے زہرخند اور شکست و ریخت، دکھ اور درد اور المیات میں جو اندرونی حسن ہے، وہ آرٹ کے ذریعہ اجاگر ہوتا ہے اور ہم حسی پہلو کی ان سمتوں کو بھی دیکھ لیتے ہیں جنہیں آسانی سے محسوس بھی نہیں کرتے۔ جمالیاتی ادراک ہی سے حقیقت پسندی میں اندرونی زندگی کے نقوش پیدا ہوتے ہیں اور تخیلی فکر اور وجدانی اور جذباتی بصیرت میں حقیقت شناسی

ہوتی ہے۔ خارجی نکات جتنے بھی حکیمانہ ہوں، وہ آرٹ کے طلسم میں جذباتی اور ذہنی نظام کے جزو بن جاتے ہیں۔

فن و ادب کے متعلق فیض کا نقطۂ نظر بہت ہی سطحی اور گمراہ کن ہے۔ "دستِ صبا" میں تحریر فرماتے ہیں۔

"ایک زمانہ ہوا جب غالب نے لکھا تھا کہ جو آنکھ قطرے میں دجلہ نہیں دیکھ سکتی دیدۂ بینا نہیں، بچوں کا کھیل ہے۔ اگر غالب ہمارے ہمعصر ہوتے تو غالباً کوئی نہ کوئی ناقد ضرور پکار اٹھتا کہ غالب نے بچوں کے کھیل کی توہین کی ہے، یا یہ کہ غالب ادب میں پروپیگنڈے کے حامی معلوم ہوتے ہیں۔ شاعر کی آنکھ کو قطرے میں دجلہ دیکھنے کی تلقین کرنا صریح پروپیگنڈا ہے۔ اس آنکھ کو تو محض حسن سے غرض ہے اور حسن اگر قطرے میں دکھائی دے جائے تو وہ قطرہ دجلہ کا ہو یا گلی کی بدرو کا، شاعر کو اس سے کیا سروکار، یہ دجلہ دیکھنا دکھانا حکیم، فلسفی یا سیاست داں کا کام ہوگا، شاعر کا کام نہیں ہے۔"

(ابتدائیہ : دستِ صبا)

آگے چل کر اس کی وضاحت اس طرح کرتے ہیں:

"یوں کہیے کہ شاعر کا کام محض مشاہدہ ہی نہیں مجاہدہ بھی اس پر فرض ہے۔ گرد و پیش کے مضطرب قطروں میں زندگی کے دجلہ کا مشاہدہ اس کی بینائی پر ہے۔ اسے دوسروں کو دکھانا اس کی فنی دسترس پر اس کے بہاؤ میں دخل انداز ہونا، اس کے شوق کی صلابت اور لہو کی حرارت پر اور یہ تینوں کام مسلسل کاوش اور جد و جہد چاہتے

ہیں۔"

(ابتدائیہ : دست صبا)

اور اس نتیجے پر آتے ہیں۔

"مجھے کہنا صرف یہ تھا کہ حیات انسانی کی اجتماعی جدوجہد کا ادراک اور اس جدوجہد میں حسب توفیق شرکت زندگی کا تقاضہ ہی نہیں، فن کا بھی تقاضہ ہے۔ فن اسی زندگی کا ایک جزو اور فنی جدوجہد اسی جدوجہد کا ایک پہلو ہے۔"

(ابتدائیہ ۔ دست صبا)

یہ ترقی پسند تنقید کا عام فارمولا ہے اور اسی فارمولے نے فیض کے بنیادی رومانی اور جمالیاتی رجحان اور ان کی شاعری کے المیہ کردار کو بھی کبھی اتنا چھپا دیا ہے کہ ان کا کلام پھیکا اور سطحی ہو گیا ہے۔ کبھی کبھی ایک اچھی نظم اپنے آخری بندوں کے پروپیگنڈے سے کوئی تاثر پیدا نہیں کرتی، ابتدا میں بات گہری ہوتی ہے لیکن اختتام تک سطحیت نمایاں ہو جاتی ہے۔ یہ کوئی نئی بات نہیں ہے، اردو شاعری میں حالی، اقبال اور جوش کی مثالیں موجود ہیں۔ ان کے نقطۂ نظر کی انتہا پسندی نے بھی یہی کچھ کیا ہے۔ فیض جمالیاتی فرحت اور جمالی قدر کی سماجی اہمیت کے قائل ہیں لیکن جمالیاتی قدر کی ہمہ گیری اس کی تہہ در تہہ کیفیتوں نہیں سمجھتے۔ جمالیاتی قدر کا مفہوم وہ اسی حد تک سمجھنا چاہتے ہیں کہ اسلوب اور ہیئت کا حسن برقرار رہے یہی وجہ ہے کہ اپنے ایک مقالے میں کہتے ہیں کہ "شعر کی مجموعی قدر میں جمالیاتی خوبی اور سماجی افادیت دونوں شامل ہیں۔" اس خیال کی وضاحت اس طرح کی ہے کہ "شعر کی جمالیاتی قدر کافی حد تک شاعر کی دوسری قدروں پر منحصر ہے، ان قدروں کی ترتیب ان کی سماجی اہمیت کے مطابق ہونا چاہیے، جمالیاتی قدر بھی ایک سماجی قدر ہے جو اجتماعی مفاد میں

نشاندہی کرتی ہے۔ "سماجی موضوعات اور شاعری کے بارے میں اس طرح سوچتے ہیں۔
موجودہ دور میں ہم ایک حساس اور ذکی شاعر سے صرف سماج اور انسانیت کی بہتری
ہی کے لئے نہیں بلکہ فن اور جمالیات کے فروغ کی خاطر بھی یہ توقع رکھتے ہیں کہ وہ ہمعصر
زندگی کی صحیح قدریں پہنچانے اور دوسروں کی رہنمائی کرے۔ اسی وجہ سے امن آزادی،
حب الوطنی سلطانی جمہور موجودہ زمانے میں ہماری شاعری کے اہم موضوعات ہونے
چاہئیں۔"

"دست تہ سنگ" میں انکی جو تقریر شامل ہے اس سے بھی ان کے نقطۂ نظر کی
وضاحت ہوتی ہے۔ "فیض از فیض" میں انہوں نے ترقی پسند تحریک، مزدور
تحریکوں، فوجی زندگی، ٹریڈ یونین اور صحافتی زندگی کے اثرات کا ذکر کیا ہے۔ اپنے
نقطۂ نظر کی وضاحت کرتے ہوئے فیض کی نظر آرٹ کی بنیادی قدروں پر نہیں
ہے، فن کی تخلیق کا عمل بہت پیچیدہ عمل ہے۔ اس کی پراسرار کیفیتوں کو اس طرح
منطقی طور پر نہیں سمجھا جا سکتا۔ فیض فن و ادب میں پروپیگنڈے کے قائل ہیں۔
اجتماعی جدوجہد کا ادراک اور اجتماعی جدوجہد میں شرکت بھی ضروری سمجھتے ہیں۔
امن اور افادہ کی باتیں اسی طرح کرتے ہیں جس طرح دوسرے بیشتر ترقی پسند
نقاد کرتے رہے ہیں۔ سماجی افادیت پر اس طرح زور دیتے ہیں جیسے سماجی افادیت
جمالیاتی قدروں میں جذب ہو کر گم ہوتی جا رہی ہے۔ جب وہ یہ کہتے ہیں کہ امن
آزادی، حب الوطنی، سلطانی جمہور موجودہ زمانے میں ہماری شاعری کے اہم
موضوع ہونے چاہئیں تو ہمیں یہ محسوس ہوتا ہے کہ فیض "زندگی کی عکاسی" اور
"تنقید حیات" کے عام پٹے پٹائے مفہوم ہی کو سب کچھ سمجھتے ہیں۔ فیض نے
کھیل کی بات کی ہے، اس سلسلہ میں حسن عسکری کا یہ جملہ بھی ذہن میں رکھیئے:
"دراصل تخلیق اتنی دہشت ناک چیز ہے کہ اگر یہ ایک بے ضرر کھیل

نہ معلوم ہو تو فن کار ان کے پاس نہ پھٹکے۔"
حسن عسکری نے میلارمے کی آواز "ہم سمندر میں چل رہے" سن کر لکھا ہے:

"جب تک شاعر خواب کو الگ رہ کر دیکھتا رہا، یہ ایک کھیل تھا لیکن جیسے ہی وہ اپنے خواب کے اندر داخل ہوا، یہ ایک مہم بن گیا۔ سمندر کے سفر کی طرح مشکل اور خطرناک۔ یہ مہم کیا ہے؟ اپنی اندرونی دنیا کی تفتیش۔"

حسن عسکری نے اپنے مضمون "ستارہ یا بادبان" میں لکھا ہے:
"فن کار یہ سوچ کر لکھنے نہیں بیٹھتا کہ اس وقت مجھے انسان کی ایک زبردست خدمت انجام دینی ہے۔ اس کی تخلیقی سرگرمی کے نتائج انسانیت کے لئے کتنے ہی اہم کیوں نہ ہوں۔ تخلیقی لمحے میں اسے نتائج سے سروکار نہیں ہوتا۔ عشق کرنے سے پہلے آدمی یہ نہیں سوچتا کہ نسل انسانی کی افزائش میرا فرض ہے۔ فن کار بھی ایک تخلیقی شہوت کے پنجے میں گرفتار ہوتا ہے، وہ اس کھیل کے لطف کی خاطر اپنے آپ کو اس تحریک کے حوالے کر دیتا ہے۔ اس معاملے میں فن کار کی حیثیت کچھ عورت کی ہے، برسوں کے دکھ تخلیقی لمحے کی لذت میں تحلیل ہو کے رہ جاتے ہیں۔ اس کھیل کی مسرت میں فن کار کو یہ بھی یاد نہیں رہتا ہے کہ وہ کونسی اذیت اپنے سر لے رہا ہے۔"

(سویرا — ۱۷-۱۸)

بات فیض کی رومانی فکر اور ان کی شاعری کے المیہ کردار کی تھی، آیئے آگے بڑھیں۔

●

فیض احمد فیض کے جذباتی تجربوں میں تخلیقی جذبہ موجود ہے۔ گریز کا رومانی عمل بھی ملتا ہے، ان کی شاعری میں وہ باطنی قدریں بھی ہیں جن سے حقائقِ زندگی پر معانی بنتے ہیں۔ التباس اور الیوژن کی اہمیت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اندرونی جاگرتی کی پہچان ہر نظم سے ہوتی ہے۔ وہ ایک اہم رومانی شاعر ہیں۔ ان کا مزاج رومانی ہے، وہ بنیادی طور پر ایک شاعر ہیں وہ شاعر جو جذبات اور نفسیات کی آگ میں تپے ہوئے تجربے پیش کرتا ہے۔ لیکن ان کی "انقلابیت" کبھی کبھی رنگ لاتی ہے، ان کا مخصوص نقطۂ نظر رنگ لاتا ہے، یہ حقیقت ہے کہ ان کا رومانی مزاج "انقلابیت" اور ٹھوس خارجی تجربوں کے میکانکی اظہار کو پسند نہیں کرتا اس کے باوجود وہ "شعوری کوشش" کرتے ہیں اور کمزور نظمیں جنم لیتی ہیں۔ جمالیاتی قوتِ تخلیق کی کمی محسوس ہوتی ہے اور فن کے معجزے نہیں ملتے۔ ذہن کی تلخی، افسردگی اور گہری افسردگی، بے چینی اور اضطراب، کشمکش اور تصادم ۔۔۔ ان تمام باتوں کے لئے اسی المیہ کردار پر انحصار ضروری ہے جسے ان کے مخصوص رجحان نے پیدا کیا ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ انہوں نے جب بھی اپنے غلط نظریۂ فن کی طرف توجہ دی ہے، اپنے محتاط رویہ اور اپنے مزاج کی گہری رومانیت کی وجہ سے بہت حد تک سستی جذباتیت اور سستی شیری سے بچے رہے ہیں۔ انہوں نے سیاسی لیڈروں کی آمنا کو اپنی آواز

کے قریب نہیں کیا ہے۔ سستے پروپیگنڈے سے دامن بچایا ہے، اپنے سلجھے ہوئے شعور کو سب کچھ سمجھا ہے۔ فیض کی ہلکی پھلکی نظموں میں بھی المیہ رجحان کی پہچان ہوتی ہے۔ دور یا عہد کی عکاسی دراصل آرٹ میں خارجی حقائق کے تمام اہم اور مستقل عناصر کا داخلی اور جذباتی اظہار ہے۔ تاثرات اور فنی تصورات کی اہمیت اس طرح زیادہ ہو جاتی ہے۔ خارجی حقائق تخلیقی شعور میں اس وقت آہستہ آہستہ کھسک جاتے ہیں جب ان کے گہرے تاثرات قائم ہو جاتے ہیں اور یہی گہرے تاثرات اہمیت رکھتے ہیں۔ ان ہی تاثرات سے فن میں ہمہ گیری، ہمیشگی اور ابدیت پیدا ہوتی ہے۔ کسی حقیقت کا اثر ہوتا ہے، تاثرات پیدا ہوتے ہیں اور آہستہ آہستہ تاثرات ہی سب کچھ ہو جاتے ہیں اور پہلا خارجی تجربہ کھسک جاتا ہے۔ ان تاثرات سے ذہنی کیفیتوں کا بھی اظہار ہوتا ہے اور شخصیت کا بھی۔ عہد اور زمانے کے نقوش بھی پیکروں اور علامتوں میں سمٹ جاتے ہیں۔ اہم عکاسی یا نقالی کا تصور تخلیقی آزادی اور تخلیقی شعور سے وابستہ ہے۔ فیض کو ان باتوں پر یقیناً سنجیدگی سے سوچنا ہے۔

فیض کا المیہ کردار ایک مکمل رومانی کردار ہے۔ وہ فرد کی ذہنی کیفیت اور عہد کے انتشار اور تضاد، کشمکش اور تصادم اور شکست و ریخت کی علامت ہے۔ اس کردار کا مطالعہ پورے معاشرے کے دکھ اور درد اور اس معاشرے کے فرد کا اداس اور مضمحل، اور آتشیں جذبات، قوت عمل اور جذبہ محبت، اس کی بت تراشی اور بت شکنی، اس کی حسرت تعمیر، اس کی خمر نوشی، لذت اندوزی، اور آرزو مندی کا مطالعہ ہے۔ یہ کردار اپنے وجدانی اور تخیلی کیفیتوں سے پہچانا جاتا ہے۔ اس کی خود مرکزیت متاثر کرتی ہے۔ فیض کی تمام نمائندہ نظموں میں خود مرکزیت موجود ہے، یہ رجحان ان کے رومانی ذہن کو نمایاں کرتا ہے۔

فیض احمد فیض کی رومانیت نے انفرادی جذبۂ عشق اور معاشرہ کو ایک دوسرے میں جذب کر دیا ہے۔ اس طرح ان کے یہاں المیہ کا جو تصور ہے وہ انفرادی غم اور معاشرے کے غم دونوں کو ایک ساتھ نمایاں کرتا ہے۔ رومانیت سے ماضی اور مستقبل کی اہمیت کا احساس ہوتا ہے۔ "حال" کو بظاہر زیادہ اہمیت نہیں رہتی حالانکہ "حال" ہی آدمی کی روح ہی بیدار ہو کر ماضی اور مستقبل پر غور کرتی ہے۔ اس عہد کا انتشار ہی اس رومانیت کو پیدا کرتا ہے۔ اپنے معاشرے کے پیچیدہ مسائل ہی شاعر کو گریز کرنے پر مجبور کرتے ہیں اور وہ ماضی اور مستقبل سے دلچسپی لینے لگتا ہے۔ کوئی شبہ نہیں کہ پوری جدید شاعری سائنس اور میکانکی زندگی کے خلاف ایک شدید ردعمل کے طور پر پیدا ہوتی ہے۔ فیض کی شاعری میں بھی شدید جذباتی ردعمل کی پہچان ہوتی ہے۔ "احساس محرومی" اور "حسرت تعمیر" نے گریز کرنے پر مجبور کیا ہے۔ ماضی اور مستقبل سے دلچسپی لیتے ہوئے فیض نے اپنے احساس محرومی کو اچھی طرح پیش کیا ہے اور اس طرح پورے معاشرے کی الجھنیں ظاہر ہو جاتی ہیں۔ پورے تمدن کا انتشار سامنے آجاتا ہے۔ "مستقبل" پر بھروسہ ہے اور ماضی سے طربیہ احساس جنم لیتا ہے لیکن اس طربیہ احساس کو صرف "ایک خواہش" کا نام دینا چاہیے۔ خوبصورت مستقبل کا خواب ایک رومانی شاعر کا سب سے اہم اور تابناک خواب ہے وہ اسی خواب کے سہارے زندہ رہتا ہے۔ یہ خواب نہ ہوتا تو شاعر "ماضی پرست" بن جاتا اور اپنی انفرادیت میں اس طرح گم ہو جاتا کہ اس کی تلاش مشکل ہو جاتی۔ فیض کی شاعری کے المیہ کردار کو سمجھنے کے لیے ماضی اور مستقبل کے تصورات کو پیش نظر رکھنا ہوگا۔ "حال" نے جو "احساس محرومی" دیا ہے اسی "احساس محرومی" نے اسے ماضی سے گہری دلچسپی لینے پر مجبور بھی کیا ہے اور مستقبل کو ایک روشن اور تابناک پیکر بھی بنایا ہے۔ تخیل

اور جذبہ، ہیجان اور جبلی عمل اور ردِ عمل ۔ یہ سب حقیقی اور تخلیقی ہیں ۔ ان کے اشاروں پر چلنا ہر عہد کی رومانی فکر کی پہچان ہے ۔ فیض اسی حقیقت کے قائل ہیں ۔ وہ اپنے عہد اور اپنی ذات کی آگ میں جلتے ہوئے اسی حقیقت کو سب کچھ سمجھتے ہیں اور اپنے تخئیل اور جذبہ اور اپنے ہیجانات اور جبلی عمل اور ردِ عمل کے سہارے گریز کرتے ہیں ۔ اس گریز کے عمل میں پورے معاشرے اور شاعر کی اپنی ذات کا المیہ ملتا ہے اور المیہ کا یہ تصور ایک طرف پورے معاشرے کی ویرانی ، الجھنیں اور انتشار کو ظاہر کرتا ہے اور دوسری طرف زندگی کی حرارت اور قوت اور آدمی کی تلاش و جستجو کی ایک واضح تصویر بھی پیش کرتا ہے ۔ جدوجہد ، تصادم اور کشمکش زوال (FALL) اور شکست کے ساتھ آرزومندی اور حزنیہ اور طربیہ احساسات کی ملی جلی کیفیت بھی ظاہر ہوتی ہے ۔ یہ آرزومندی اور یہ احساسات بڑی اہمیت رکھتے ہیں اس لئے کہ تاریک رات میں "صبح" کا انتظار اور تابناک اور روشن "کل" کا جذباتی تصور بھی ان ہی سے جنم لیتا ہے ۔

●

فیض کی نظم "ملاقات" ان تمام حقائق کو پیش کرتی ہے جن کا ذکر کیا گیا ہے۔

یہ رات اس درد کا شجر ہے
جو مجھ سے تجھ سے عظیم تر ہے
عظیم تر ہے کہ اس کی شاخوں
میں لاکھ مشعل بکف ستاروں
کے کارواں گھر کے کھو گئے ہیں
ہزار وں مہتاب اس کے سائے
میں اپنا سب نور کھو گئے ہیں

یہ رات اسی درد کا شجر ہے
جو مجھ سے تجھ سے عظیم تر ہے

مگر اسی رات کے شجر سے
یہ چند لمحوں کے زرد پتّے
گرے ہیں اور تیرے گیسوؤں میں
اُلجھ کے گلنار ہو گئے ہیں
اسی کی شبنم سے خامشی کے
یہ چند قطرے، تری جبیں پر
برس کے ہیرے پرو گئے ہیں

(۲)

بہت سیہ ہے یہ رات لیکن
اسی سیاہی میں رونما ہے
وہ نہرِ خوں جو مری صدا ہے
اسی کے سائے میں نور گر ہے
وہ موجِ زر جو تری نظر ہے

وہ غم جو اس وقت تیری باہوں
کے گلستاں میں سلگ رہا ہے

(رہ غم، جو اس رات کا ثمر ہے)

کچھ اور تپ جائے اپنی آہوں
کی آنچ میں تو یہی شرر ہے
ہر اک سیہ شاخ کی کماں سے
جگر میں ٹوٹے ہیں تیر جتنے
جگر سے نوچے ہیں اور ہر اک
کا ہم نے تیشہ بنا لیا ہے

(۳)

الم نصیبوں، جگر فگاروں
کی صبح، افلاک پر نہیں ہے
جہاں پہ ہم تم کھڑے ہیں دونوں
سحر کا روشن افق یہیں ہے
یہیں پہ غم کے شرار کھل کر
شفق کا گلزار بن گئے ہیں
یہیں پہ قاتل دکھوں کے تیشے
قطار اندر قطار کرنوں

کے آتشیں ہار بن گئے ہیں
یہ غم جو اس رات نے دیا ہے
یہ غم سحر کا یقین بنا ہے
یقین جو غم سے کریم تر ہے
سحر جو شب سے عظیم تر ہے

ملاقات کا درد اور اس کی لذت کا اندازہ کیجیے۔ فیض کا المیہ مزاج انسان کا جذباتی اور رومانی رجحان اچھی طرح ظاہر ہوتا ہے شعوری مشاہدہ بھی ہے اور فکری قوت بھی۔ حزنیہ اور طربیہ احساسات کی ملی جلی کیفیت قابل غور ہے۔ "کل" کا حسیاتی تصور رومانی فکر کی تخلیق ہے۔ تخیل اور جذبہ کی آمیزش بھی ہے اور حسی ردعمل کے نقوش بھی ہے۔ فنی اور تکنیکی اعتبار سے بھی یہ ایک کامیاب اور مکمل نظم ہے۔ اس نظم کا آہنگ شاعر کی شخصیت اور اس کی مزاج کی کیفیتوں کو سمجھاتا ہے۔ ایک المیہ کردار اپنے دہکتے ہوئے سجدوں کو چھپائے کھڑا ہے۔ اپنے درد کی لذت سے آشنا ہے۔ عصری ہیجانات کی پہچان بھی آسان ہے۔ اس عہد کے آدمی کی خواہش اور تمنا، اس کی آرزو مندی اور اس کے "الیوژن" کو بھی دیکھا جاسکتا ہے۔

اس نظم کے تاثرات کے پیچھے جانے کتنے خارجی تصورات اور جانے کتنی خارجی قدروں کی کشمکش موجود ہے۔ فیض کے المیہ وجدان کا مطالعہ کرتے ہوئے اس نظم کو نظرانداز نہیں کر سکتے۔ اندرونی جاگرتی نے اس المیہ وجدان کو پیدا کیا ہے۔ شدتِ غم بھی ہے اور آرزومندی بھی ہے احساس اور جذبے

کے اظہار کے لئے جمالیاتی شعور نے حسی تصورات اور پیکروں کی تخلیق کی ہے۔

"درد کا شجر" "لمحوں کے زرد پتے" اور "خاموشی کے قطرے" عنوان سے داخلی کیفیتوں کو سمجھا جا سکتا ہے۔ فیضؔ نے اس نظم میں "رات" "شاخ" "ستارے" "کارواں" "مہتاب" "شجر" "پتے" "گیسو" "شبنم" "جبیں" "بہر خوں" "گلستاں" "شرر" "کماں" "جگر" "تیر" "تیشہ" "افق" "سحر" "شفق" "گلزار" اور اس قسم کے دوسرے عام الفاظ استعمال کئے ہیں، لیکن یہ الفاظ علامتوں کی صورت میں ہیں۔ عصری ہیجانات اور ذہنی اور جذباتی کشمکش سے جو تصورات پیدا ہوئے تھے وہ داخلی بن گئے ہیں۔ یہ تمام خارجی الفاظ حسی کیفیتوں کو سمجھاتے ہیں۔ ہر علامت داخلی کیفیت کی ترجمان ہے۔ فیضؔ نے رات کا ایک حیاتی تصور "شجر" کے روپ میں پیش کیا ہے۔ صرف دو مصرعوں میں عہد اور معاشرے کی المناک قدروں اور غم اور دکھ اور درد کے بے پناہ پھیلے ہوئے سمندر کو سامنے رکھ دیا ہے۔

یہ رات اس درد کا شجر ہے

جو مجھ سے تجھ سے عظیم تر ہے

رات زندگی کے درد اور غم کی علامت بھی ہے۔ شاعر نے اس رات کو درد اور غم کا شجر کہا ہے اور شجر کی مناسبت سے دوسرے الفاظ کا استعمال کیا ہے اور انہیں علامتی رنگ دے دیا ہے۔ "رات" اور "شجر" دونوں داخلی کیفیتوں کے خوبصورت اور حسین کنائے ہیں۔ رات کے ساتھ گذرتے ہوئے وقت کا تصور پیدا ہوتا ہے، آنے والے لمحوں کا احساس جنم لیتا ہے۔ "شجر" جتنا بھی جامد ہو، اس کا حیاتی تصور جامد نہیں ہے اس لئے کہ یہ خود "رات" کا پیکر ہے۔ شاعر کے جذبے

کی طرح حسی تصور میں بھی شدت اور تیزی ہوتی ہے۔ قاری کے اپنے جذبات سے ہم آہنگ ہو کر بھی یہ حسی تصور جامد نہیں بنتا، اس لئے کہ قاری کے جذبات میں بھی شدت اور تیزی ہوتی ہے۔ اس طرح "رات" اور "شجر" دونوں کے حیاتی تصورات مسلسل حرکت کی کیفیتوں کو پیش کرتے ہیں۔

اس پوری نظم کے مطالعہ سے رفتار اور حرکت کی اہمیت کو سمجھنا مشکل نہیں ہے۔ شاعر نے اس رات کو درد کا "شجر" کہہ کر دراصل ایک مرکز کا احساس پیدا کیا ہے۔ یہ شجر (رات) عظیم تر ہے اس لئے کہ اس کی شاخوں میں لاکھ مشعل بکف ستاروں کے کارواں گھِر کے کھو گئے ہیں اور ہزار مہتاب اس کے سائے میں اپنا سب نور کھو گئے ہیں۔ ہزاروں مہتاب اور لاکھوں ستاروں کی روشنی اس رات کی تاریکی میں گم ہو چکی ہے۔ اس کی کہانی طویل ہے۔ یہ رنگ، نغمہ اور روشنی کی کہانی ہے۔ یہ آدمی اور اس کی زندگی کا افسانہ ہے۔ شاعر نے 'مہتاب' اور 'ستاروں' سے استعاروں کو نہایت ہی فنکارانہ طور پر استعمال کیا ہے۔ یہ دونوں علامتیں اہم ہیں یہاں فیضؔ کی شاعری کا المیہ کردار اپنے مخصوص تصورات اور رجحانات کے ساتھ ابھرتا ہے۔ وہ درد و غم کو شدت سے محسوس کرتے ہوئے دوسرے پہلوؤں کو بھی دیکھتا ہے۔ وہ خلیت پسندی ایسی ہے کہ محبوب کے تصور میں بڑی ہمہ گیری پیدا ہو گئی ہے۔

مگر اسی رات کے شجر سے
یہ چند لمحوں کے زرد پتے
گرے ہیں اور تیرے گیسوؤں میں
اُلجھ کے گلنار ہو گئے ہیں

اور پھر یہ کہتا ہے:

وہ غم جو اس وقت تیری باہوں
کے گلستاں میں سلگ رہا ہے
(وہ غم، جو اس رات کا ثمر ہے)
کچھ اور تپ جائے اپنی باہوں
کی آنچ میں تو یہی شرر ہے

المیہ ہیرو کا غم ہی اس کی دولت ہے، وہ اپنے غم اور اپنے جذبات کی آنچ سے راستے ٹٹولتا ہے۔ سوزِ غم ہی اس کا ساتھی ہے۔ باہوں کی آنچ سے جب یہ غم اور تپ جائے تو یہی غم شرر بن جاتا ہے۔ المیہ کردار کے رجائی رجحان کی اہمیت کا احساس، اسی منزل پر ہوتا ہے۔ اپنے نصب العین کو پانے اور اپنی تمنا اور اپنی آرزو کی تکمیل کے لئے وہ داخلی کشمکش کا شکار رہتا ہے۔ اس کی آہوں کی آنچ سے اس کا غم شرر بن جاتا ہے اور پھر وہ اضطراب کا پیکر بن جاتا ہے

فیض کے رومانی ذہن کا مطالعہ کرتے ہوئے اس کردار کو نظر انداز نہ کیجئے اس کردار کی بے چینی اور مضطرب شخصیت، اس کی خود مرکزیت، اس کی حسرتِ تعمیر، اور اس کی لذت اندوزی شاعر کی رومانیت کو بے نقاب کرتی ہے۔ اس المیہ کردار کے زخموں کی ٹیس اور اس ٹیس کی لذت اور اس کی اضطراری کیفیتوں کو دیکھیے:

ہر اک سیہ شاخ کی کماں سے

جگر میں ٹوٹے ہیں تیر جتنے

جگر سے نوچے ہیں اور ہر اک

کا ہم نے تیشہ بنا لیا ہے

اس عہد کے اضطراب کی یہ علامت فیض کی شاعری کا عطیہ ہے۔ اضطراب کا یہ پیکر اپنے عقائد اور اپنی ذات پر سب سے زیادہ بھروسہ اور اعتماد کرتا ہے۔ وہ اس رات کے دیئے ہوئے غم کو سحر کا یقین سمجھتا ہے اور اس یقین کو غم سے کریم تر سمجھتا ہے اور یہ سوچتا ہے کہ سحر شب سے عظیم تر ہے۔ اسے صبح کا انتظار ہے۔ گذرتے ہوئے لمحوں کو دیکھ کر اسے یقین ہے کہ جس صبح کا وہ منتظر ہے وہ صبح ضرور آئے گی۔ ان نصیبوں اور جگر فگاروں کی صبح افلاک پر نہیں ہے بلکہ سحر کا روشن افق وہیں ہے جہاں غم جلا ہے، درد ٹلا ہے، رات ٹلی ہے، تاریکیاں ٹلی ہیں اور جہاں تاریکیوں میں انہیں آہوں کی آنچ سے غم کی شدت بڑھائی گئی ہے۔ ہر وہ ذرہ روشن ہو جائے گا جس پر لہو گرا ہے۔

شاعر کے سیال جذبوں، اس کے رومانی انداز فکر اور اس کے حسی تصورات کو سمجھنے میں اس نظم سے بہت مدد ملتی ہے۔ یہ موضوع نیا نہیں ہے۔ فیض کی بعض دوسری نظموں میں بھی یہ موضوع ملتا ہے۔ دراصل یہ موضوع اس عہد کا ایک خاص موضوع ہے۔ پورے معاشرے کو نئی صبح کا انتظار ہے۔ بہت سے شاعروں نے اس موضوع کو مختلف طریقوں سے پیش کیا ہے۔ فیض کا رجحان مختلف ہے۔ ان کی انفرادیت نے اس موضوع کو ایک نئے انداز سے ابھارا ہے۔ پیکر تراشی کا فن،

لب و لہجہ، شخصیت کا کرب اور اظہار و ابلاغ متاثر کرتا ہے۔
فیض نے اپنے مخصوص لہجہ میں "اے دلِ بیتاب ٹھہر" میں کہا تھا:

رات کا گرم لہو اور بھی بہہ جانے دو
یہی تاریکی تو ہے غازۂ رخسارِ سحر
صبح ہونے ہی کو ہے اے دلِ بیتاب ٹھہر

"چند روز اور میری جان" میں کہتے ہیں:

لیکن اب ظلم کی میعاد کے دن تھوڑے ہیں
اِک ذرا صبر کہ فریاد کے دن تھوڑے ہیں

"صبحِ آزادی" میں یہی خیال ملتا ہے:

ابھی گرانیٔ شب میں کمی نہیں آئی
نجاتِ دیدہ و دل کی گھڑی نہیں آئی
چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی

"زنداں نامہ" کی ایک نظم میں فرماتے ہیں:

ہو نہ ہو اپنے قبیلے کا بھی کوئی لشکر
منتظر ہوگا اندھیرے کی فصیلوں کے اُدھر

اُن کو شعلوں کے رجز اپنا پتہ تو دیں گے
خیر ہم تک وہ نہ پہنچیں بھی صدا تو دیں گے
دُور کتنی ہے ابھی صبح، بتا تو دیں گے

آپ نے یہ بھی سنا ہو گا:

رات باقی تھی ابھی جب سرِ بالیں آ کر
چاند نے مجھ سے کہا "جاگ سحر آئی ہے"

"سیاسی لیڈر کے نام" میں رات اور تاریکی کا ہی ذکر ہے:

سالہا سال یہ بے آسرا جکڑے ہوئے ہات
رات کے سخت و سیہ سینے میں پیوست رہے
جس طرح تنکا سمندر سے ہو سرگرم بستز
جس طرح تیتری کہسار پہ یلغار کرے
اور اب رات کے سنگین و سیہ سینے میں
اتنے گھاؤ ہیں کہ جس سمت نظر جاتی ہے
جا بجا نور نے اک جال سا بُن رکھا ہے
دور سے صبح کی دھڑکن کی صدا آتی ہے

"صبحِ آزادی" "سرِ مقتل" "ایرانی طلبہ کے نام" "نثار میں تیری گلیوں پہ" "زنداں کی ایک صبح" "ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے" "درد آئے گا دبے پاؤں" "شام" "قیدِ تنہائی" "شہرِ یاراں" "پاس رہو" اور دوسری کئی نظموں میں رات اور صبح کا ذکر ہے۔ رات کی آہنی میتت کے تلے دبے ہوئے المیہ کردار کو صبح کا انتظار بھی ہے۔ فیض کی غزلوں میں بھی یہ موضوع ملتا ہے، چند اشعار سنیے:

صبا نے پھر درِ زنداں پہ آ کے دستک دی
سحر قریب ہے، دل سے کہو کہ نہ گھبرائے

ہجر کی شب تو کٹ ہی جائے گی
روزِ وصلِ صنم کی بات کرو

نہ تیرگی ہے رہِ بتاں میں چراغِ رخ ہے نہ شمعِ وعدہ
کرن کوئی آرزو کی لاؤ کہ سب در و بام بجھ گئے ہیں

کب ٹھہرے گا درد اے دل کب رات بسر ہوگی
سنتے تھے وہ آئیں گے، سنتے تھے سحر ہوگی

کہاں گئے شبِ فرقت کے جاگنے والے
ستارۂ سحری ہم کلام کب سے ہے

جاؤ اب سو رہو ستارو
درد کی رات ڈھل چکی ہے

دل ناامید تو نہیں، ناکام ہی تو ہے
لمبی ہے غم کی شام مگر شام ہی تو ہے

دستِ فلک میں گردشِ تقدیر تو نہیں
دستِ فلک میں گردشِ ایام ہی تو ہے

جو ہم پہ گذری سو گذری مگر شبِ ہجراں
ہمارے اشک تری عاقبت سنوار چلے

صبح کی طرح جھمکتا ہے شبِ غم کا افق
فیضؔ، تابندگیٔ دیدۂ تر تو دیکھو

تاریکی کے گہرے احساس اور صبح کے انتظار نے فیضؔ کو بہت سی علامتیں دی ہیں اور وہ ان علامتوں کا استعمال نہایت ہی فنکارانہ طور پر کرتے ہیں۔

فیضؔ کی شاعری کی فضا تاریکی اور شام کے اندھیرے کی فضا ہے۔ ہر تجربے پر تاریکی کا پراسرار پرتو ہے۔ یہ شاعری روح کی تنہائی اور تشنگی کی شاعری ہے۔ رات کی تاریکی اور شام کی پرچھائیوں میں اس شاعری کا المیہ کردار ابھرتا ہے۔ کبھی فضا بہت ہی غمگین اور اداس ہو جاتی ہے۔ تاریکی میں یہ کردار سرگوشیاں کرتا ہے، عہد کرتا ہے، عمل کرتا ہے، شکست کھاتا ہے، جدوجہد کرتا ہے وہ اندھیرے میں کسی کا انتظار کرتا ہے اور یہ بھی جانتا ہے کہ آدمی اکثر اندھیرے میں قتل ہوا ہے۔

فیضؔ نے دعوب سے نہیں، تاریکی سے دلچسپی لی ہے اس ماحول میں تنہائی بھی ہے اور افسردگی بھی، تھکن بھی ہے اور بے رنگی بھی۔ فیضؔ کے لہجے میں خوابناکی اور نغمگی ہے ان سے پورا ماحول اپنے جذبات سے ہم آہنگ ہو جاتا ہے۔ پیکروں اور ذہنی پیکروں سے ایک نئی علامتی فضا کی تعمیر ہوتی ہے اور اس طرح انسانی تاریخ کا المیہ ادبی اور فنی قدروں میں زیادہ دلفریب اور تابناک بن جاتا ہے۔ اور المیہ قدروں کا حسن نمایاں ہوتا ہے۔

رات کے اندھیرے اور شام کی پراسرار پرچھائیوں کی شاعری جذبات کے مختلف رنگوں کی شاعری ہے۔ جذبہ اور پیکر یہ دونوں حسیات اور ہیجانات کو متاثر کرتے ہیں۔ تاریکی میں تاریخ، معاشرت اور عشق و محبت کی قدریں سمٹ آئی ہیں اور مختلف علامتیں ابھری ہیں۔ اس اندھیرے میں بھی ہم فیض کے واضح اور گہرے شعور کو پہچان لیتے ہیں۔ ان کی فکر کی گہرائی اور توانائی کا اندازہ کر لیتے ہیں۔ ان کے دردمند دل کی پہچان پہلی نظر میں ہو جاتی ہے۔ تاریکی میں اجالے کی آرزو اور اندھیرے میں حسن کی تلاش ملتی ہے۔ فیض کی نظموں کی غنائیت اور نغمگی، اور بلیغ اشاریت اور ایمائی ندرت ہر لمحہ متاثر کرتی ہے۔ بات یہ ہے کہ یہ سب کچھ تخلیقی کرب کی وجہ سے ہے۔ اندرونی کرب کو نغمہ بنانا ہی فنکاری ہے۔

اس گہری تاریکی میں فرد کے ارمانوں کا خون ملتا ہے، شکستِ خواب کے دھندلے نقوش ملتے ہیں، زندگی کی المناکی مختلف حسیاتی پیکروں اور تصویروں میں ملتی ہے۔ شدتِ تاثر سے ہر پیکر متحرک بن گیا ہے۔

فیض کی شاعری میں "تاریکی" "اندھیرا" "شام" اور "سیاہی" کی علامتیں زیادہ ہیں۔ ان سے نظامِ زندگی کے اندھیرے، تاریخی قدروں کی شکست و ریخت، اور ظلم و جبر کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے، اور ساتھ ہی ان علامتوں سے محرومیوں، ناکامیوں، گہری افسردگی اور خاموشی، محبوب کی زلف اور دل کے داغ کی کیفیتوں کو بھی ظاہر کیا گیا ہے۔ ان کی شاعری میں سرخ رنگ کی بھی اہمیت ہے۔ آنچل، رخسار، پیراہن اور جد و جہد کی زندگی میں خونِ جگر اور گہرے زخموں کی اہمیت کو سمجھانے کے لئے اس رنگ سے مدد لی گئی ہے یہ دونوں رنگ دراصل دو مستقل علامت ہیں اور فیض کی شاعری کا مطالعہ

ان علامتوں کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ فیض صبح کی روشنی اور چاندنی سے بھی کم دلچسپی نہیں لیتے ____ "رات کا گرم لہو" "رات کے سنگین اور سیہ سینے" "تیرہ خوں" "تاریک راہوں" "تاریک پیمانہ ظلم" "خون میں نہائے ہوئے" "سرخ و سیہ صدیوں کے سائے" "ہتھیلی پر لہو" "لہو رنگ" "داغ داغ اجالا" "شب گزیدہ سحر" "خون عشاق" "آسمانوں کا لہو" "خون کی آگ" "ظلمات دنیا" "ضیاء حسن" "حسرتوں کے داغ" "چاندنی کی تھکی ہوئی آواز" "عہد غم" "سفید رخ" "برگ گل" "رنگ پیراہن" "چاندنی کا دامن" "خون جگر" "صبح بہار" "غازہ رخسار" "سرخ ہونٹوں پر تبسم" "سے گلنار ہیں یاسمن کے پھول" "ظلمت یاس" "شمع آرزو" "عہد غم کی حکائتیں" "خمار شباب سے رنگین نگاہ" "تخئیل پر برستی بجلیاں" "بیاض رخ پہ سحر کی صباحتیں" "سیاہ زلفوں میں وارفتہ نکہتوں کا ہجوم" "طویل راتوں کی خوابیدہ راحتیں" "چاند کا دکھ بھرا فسانۂ نور" "خوابگاہوں کی نیم تاریکی" "نیم خواب شبستان" "خون بہار" "مہتاب کا نور" "راتوں کی کسک" "غریبوں کا لہو" "تاروں کا غبار" "خوابیدہ چراغ" "بے خواب کواڑ" "شام سحر" "ظلم کی چھاؤں" "چاندنی راتوں کا درد" "آہنگر کی دوکان" "تند شعلے" "سرخ آہن" "خورشید جہانتاب" "نور سحر" "ساز طرب میں آگ" "دیدۂ تر کے شعلے" "شمع بزم صبح" "افسردہ سلگتی ہوئی شام" "چلمن کی رنگینی" "کاجل کی لکیر" "غازے کا غبار" "حنا کی تحریر" "دہکتے ہوئے شہر" "گل شدہ شمعوں کی قطار" "نور خورشید" "دل کے تاریک شگاف" "رات کے سخت و سیاہ سینے" "گھاؤ" "صبح کی دھڑکن" "غلبۂ ظلمت" "دھڑکتا ہوا دن" "رات کی آہنی میت" "شب کی رگوں سے لہو" "رات کا گرم لہو" "خون کی مہک" "صبح گلستاں" "ڈھلتا سورج"

"راتوں کا سیہ فام جلال" "صبحوں کی عنانِ گلگیں" "خون کی آگ" "ماہ تمام کی دمک" "صحبتِ شب" "جگر کے چاک" "سحر کا دام" "دامنِ شام" "شب ہنگاماں" "شبِ غم" "درد کا رنگ" "خونِ دلِ وحشی" "خونِ بلبلاں" "نور کی لہر" "صبح کی تمہید" "صبح سخن" "شام نظر" "بجھے ہوئے راستے" "زخموں کے ایاغ" "نشترِ صبح" "خون آلود کفت" "عشق کے حجرہ میں آگ" "ماتمی تاروں کی صف" "وحشتِ شب" "سرخ پھولوں کا رنگ"

ان سے فیضؔ کے رجحان اور ذہنی رویہ کو اچھی طرح سمجھا جا سکتا ہے۔ رات اور صبح، سیاہ اور سرخ، روشنی اور تاریکی سے شاعر کی دلچسپی نے جانے کتنے پیکر تراشے ہیں۔

شاعر کے المیہ رجحان کا مطالعہ کرتے ہوئے ان پیکروں کو بھی پیش نظر رکھیے۔

فیض کی شاعری کا المیہ کردار اداسی، خاموشی اور تاریکی میں انتظار کا درد لیے ابھرتا ہے۔ یہ کردار درد و گداز اور کیف و لذت کا پیکر ہے، اس کی بے ہیئتی اور کشمکش، اس کا اضطراب اور اس کی تپش متاثر کرتی ہے۔ وہ عشق و محبت کے جذبے سے سرشار ہے۔ وہ غمِ جاناں اور غمِ دوراں دونوں کی علامت ہے۔ اس کے جھکے ہوئے احساسِ حسن سے ہم متاثر ہوتے ہیں۔ اس کی یادیں جانے کتنی کہانیاں لے کر آتی ہیں۔ زندگی کی المناکی یا TRAGIC — SENSE نے اس کردار کی تخلیق کی ہے۔ ہم المیہ یا ٹریجڈی سے نہیں بلکہ اس کے حسن سے متاثر ہوتے ہیں۔ شاعر کا جمالیاتی شعور ہی المیہ کے حسن کو پیش کر سکتا ہے اور قاری کے احساسِ جمال کو جگا سکتا ہے۔ ایک مخصوص سیاسی اور سماجی ماحول میں المیہ کا تصور یا ایک المیہ رجحان پیدا ہوتا ہے۔ لیکن جب اس رجحان سے فن و ادب میں ایک المیہ کردار کی تخلیق ہوتی ہے تو اس کردار کی کل کائنات وہ مخصوص سیاسی اور سماجی فضا نہیں ہوتی۔ فن کار کا جمالیاتی شعور اور اس کی رومانیت اسے ایک علامت بنا کر آفاقی قدروں سے ہم آہنگ کر دیتی ہے۔ فیض اس حقیقت سے آگاہ ہیں کہ میکانکی زندگی سے گریز ضروری ہے۔ زندگی کے میکانکی عمل سے ابھرنے والا کردار میکانکی کردار بن کر نہیں رہ جاتا، بلکہ وہ ایک مکمل رومانی

رداربن جاتا ہے۔ اس کی علامتی اہمیت اس حد تک ہے کہ وہ اپنے عہد کی تمدنی
یخی اور ثقافتی کشمکش اور انتشار کی علامت ہے۔ فیض ایک حساس شاعر
ں اور وہ جبلیاتی کشمکش کا ایک واضح شعور رکھتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں
ر تجربوں کی دنیا بہت وسیع ہے۔ اور انگنت تجربے المیہ رجحان کے ذریعہ
ش ہو سکتے ہیں۔ ظاہر ہے ان کے لئے ایک گونہ عرفانِ ذات اور ایک گونہ
تماد کی ضرورت ہے۔ فیض کی نظموں میں عرفانِ ذات اور استحکامِ ذات کو
م اچھی طرح محسوس کرتے ہیں۔ جذباتی بیداری المیہ کردار کی سب سے بڑی
ری ہے۔ فیض کی شاعری میں جذباتی بیداری ہر جگہ متاثر کرتی ہے۔
سر ودِ شبانہ" "میرے ندیم" "مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ"
سوچ" "رقیب سے" "چند روز اور مری جان" "موضوعِ سخن" "ہم لوگ"
ے دلِ بیتاب ٹھہر" "میرے ہمدم مرے دوست" "صبحِ آزادی" "دو آوازیں"
طوق و دار کا موسم" "نثار میں تیری گلیوں پہ ..." "شیشوں کا مسیحا کوئی
ہیں" "زنداں کی ایک شام" "زنداں کی ایک صبح" "یاد" "ملاقات"
ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے" "درد آئے گا دبے پاؤں" "دست
تہ سنگ آمدہ" "شام" "پاس رہو" اور دوسری نظموں میں فیض کی جذباتی
بیداری ہی سب سے زیادہ متاثر کرتی ہے۔ صوری اور معنوی اعتبار سے یہ
تمام نظمیں اہم ہیں اور ہر نظم میں ایک حساس ذہن ملتا ہے۔ جذباتی
کشمکش ملتی ہے۔ معنوی ترنم اور داخلی آہنگ بھی ہے۔ جذباتی بیداری
سے عام تجربوں میں بھی گہرائی پیدا ہو گئی ہے۔ المیہ قدریں جمالیاتی شعور کی
روشنی سے روشن اور تابناک بن گئی ہیں اور ان میں جمالیاتی خصوصیتیں پیدا
ہو گئی ہیں۔

فیض حسن پسند ہیں۔ ان کے مزاج کی رومانیت جانے کتنے پیکروں کی تخلیق کرچکی ہے۔ وہ عورت کے تصور کو کسی لمحہ دور نہیں کر سکتے، اور حقیقت یہ ہے کہ ان کی کامیاب نظموں کی یہی خوبی ہے کہ ان نظموں کی پیکر تراشی عورت کے تصور سے وابستہ ہے۔ اردو اور فارسی شاعری کی زندہ روایات کو اپناتے ہیں۔ تغزل اور مغربی شاعری کی غنائیت دونوں کا ایک خوش گوار اور بلیغ توازن ملتا ہے۔ اپنے ناقدانہ شعور اور فنی بصیرت سے انھوں نے نئی نظم کو ایک نئی راہ دکھائی ہے۔ اردو اور فارسی شاعری کی علامتوں، استعاروں اور اشاروں کا نہایت ہی فنکارانہ استعمال ملتا ہے۔ فیض کی انفرادیت کا مطالعہ کرتے ہوئے ان حقائق کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

شاعری میں کلاسیکی آبرو کو قائم رکھنا بڑی بات ہے۔ فیض نے زندہ روایتوں کو آگے بڑھایا ہے۔ ایک نئے اسلوب میں ماضی کی روائتیں ملتی ہیں۔ روشن اور تابناک بن کر ــــــ ان کی نظموں میں لہجے کا اعتماد متاثر کرتا ہے اور فضا اور تاثر کی وحدت متاثر کرتی ہے۔ اس دور میں فیض نے المیہ تجربوں کو جذبے کی شدّت کے ساتھ جس طرح محسوس کیا ہے اس کی دوسری مثال نہیں ملتی۔ ہم جانتے ہیں کہ حسن کا ادراک نہایت ہی پراسرار طریقے سے حاصل ہوتا ہے۔ فیض کے کلام کا مطالعہ کرتے ہوئے اس حقیقت کا زیادہ احساس ہوتا ہے۔ انھوں نے ہر تجربہ اور ہر موضوع میں حسن کو دیکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیں ان کے جمالیاتی شعور سے مایوسی نہیں ہوتی۔ "نقش فریادی" "زنداں نامہ" "دستِ صبا" اور "دستِ تہ سنگ" کی نظموں کا مطالعہ کرتے ہوئے شاعر کے المیہ رجحان: اس کے المناک،

...یوں، اس کی حسن پسندی اور گہری رومانیت، اس کے ناقدانہ شعور اور
...ں کی فنی بصیرت، اس کے لہجے کے اعتماد، اور اس کے جمالیاتی شعور کی پختگی
...غور فرمایئے۔ جدید آدمی کے ذہن کی تمام پیچیدگیوں اور پورے تمدّن
...ے تلخ اور ترش اور شیریں حقائق کا انکشاف ایک مکمل رومانی ذہن اور ایک
...ختہ المیہ رجحان کے ذریعے ہوا ہے۔

فیض کی ایک نظم "شام" پڑھئے:

اس طرح ہے کہ ہر اک پیڑ کوئی مندر ہے
کوئی اجڑا ہوا، بے نور پرانا مندر
ڈھونڈتا ہے جو خرابی کے بہانے کب سے
چاک ہر بام، ہر اک در کا دمِ آخر ہے
آسماں کوئی پروہت ہے جو ہر بام تلے
جسم پر راکھ ملے، ماتھے پہ سیندور ملے
سرنگوں بیٹھا ہے، چپ چاپ نہ جانے کب سے

اس طرح ہے کہ پسِ پردہ کوئی ساحر ہے
جس نے آفاق پہ پھیلایا ہے یوں سحر کا دام
دامنِ وقت سے پیوست ہے یوں دامنِ شام

اب کبھی شام بجھے گی نہ اندھیرا ہو گا
اب کبھی رات ڈھلے گی نہ سویرا ہو گا

آسماں آس لئے ہے کہ یہ جادو ٹوٹے
چپ کی زنجیر کٹے وقت کا دامن چھوٹے
دے کوئی سنکھ دہائی، کوئی پائل بولے
کوئی بت جاگے، کوئی سانولی گھونگھٹ کھولے

(دست تہ سنگ)

اس نظم میں ایک مکمل رومانی فضا ہے۔ تجربے کی عمومیت، ہمہ گیری اور تاثیر غضب کی ہے۔ رمزیت متاثر کرتی ہے۔ شاعر نے ماحول کے ذہنی اور جذباتی تاثر کو اپنے علامتی اسلوب میں پیش کیا ہے۔ فضا کی نرمی بھی ہے اور لہجہ کی دردناکی بھی۔ شاعر کے المیہ رجحان نے المناک تجربوں کو تمثال حسی (SENSOR IMAGES) کے ذریعہ نمایاں کیا ہے۔ تخلیقی تخیل اور شدید جمالیاتی تاثر پر غور فرمائیے۔ اس نظم کی تصویریت (PICITUR EQUENESS) سے شاعر کی قوتِ تخلیق کو سمجھا جا سکتا ہے۔ یہ حواس اور جذبے کی شاعری ہے۔ جذبات میں جو درد ہے وہ جذبوں کا درد معلوم ہوتا ہے۔ شام کی یہ تصویر عصری ہیجانات اور جذباتی آزردہ مندی کی تصویر ہے۔ فیض کا آرٹ نیم اظہار کا آرٹ ہے۔ اس نظم کی نیم گویائی بھی قابلِ غور ہے۔ پوری نظم کے موڈ کی پہچان رومانی اسلوب

ے ہوتی ہے۔ ایک فضا بنتی ہے، مکمل رومانی فضا۔ رومانی تخیل تخلیقی ہے۔ ردسو نے کہا تھا۔ "میری خوشی اس میں ہے کہ میں تنہا پھر تا رہوں۔ دور درختوں میں، چٹانوں پر تاکہ آزادی ہے جو چاہوں سوچوں۔" فیض بھی سوچنے کے لئے تنہائی چاہتے ہیں۔ اور اکثر شام، رات، چاندنی، خاموشی اور تاریکی میں اپنے تخیلی پیکروں اور اپنے حسیاتی پیکروں کو ابھارنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کی صنم گری رات چاہتی ہے، شام اور تاریکی چاہتی ہے، خاموشی اور چاندنی چاہتی ہے۔ ان کا رومانی تخیل ایک مخصوص ماحول اور ایک مخصوص فضا میں متحرک بنتا ہے۔ "شام" جدید نظم میں ایک قابلِ قدر اضافہ ہے۔ "مندر" ہر ایک پیڑ" کا حسیاتی پیکر ہے، اسے دیکھ کر یہ محسوس ہوتا ہے کہ برسوں سے اجڑا ہوا، بے نور پرانا مندر ہے، ہر دیوار شکستہ ہے، اندر وحشت، آسمانوں اور شام کا میچ ہے۔ پروہت جسم پر راکھ ملے اور ماتھے پر سیندور ملے چپ چاپ جانے کب سے سرنگوں بیٹھا ہے۔ تلخیوں سے گریز کر کے شاعر اس ماحول میں آیا ہے، اس کھنڈر کے وہ نقوش دیکھ رہا ہے جو خود عصری ہیجانات اور زندگی کی تلخیوں کے اشارے ہیں، اس نظم میں ایک خاص قسم کی بیتابی ہے جسے ہم رومانی بیتابی کہہ سکتے ہیں۔ عموماً غیر مہذب بیتابی کا اظہار کر کے شعراء اپنی بے تربیت رومانی فکر کا آئینہ دکھاتے ہیں۔ فیض کی رومانی بیتابی غیر مہذب نہیں ہے نظم کے آخر میں جو رومانی آرزومندی ہے اس سے شاعر کے پختہ شعور، اور مہذب اور تربیت یافتہ ذہن کی پہچان ہوتی ہے۔ ابتدا میں جو تصویر سامنے آتی ہے وہ علامتی تصویر ہے۔ "مندر" ایک حسیاتی تصور ہے جو داخلی ہیجانات اور شاعر کے جذبات سے ابھرا ہے۔ جو منظر سامنے ہے اس میں اور شاعر کے جذبات میں گہرا رشتہ ہے۔ وائٹ ہیڈ نے کہا تھا کہ آدمی کے احساسات اور بے جان اشیاء، ایک دوسرے کو متاثر کرتی ہیں، پہاڑ اور

جھیل، الٰہ آدمی کے احساسات دو مختلف اور متضاد حقیقتیں نہیں ہیں بُوڑھا اور شکستہ مندر کا یہ موضوع خالص رومانی موضوع ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ داخلی زندگی میں ویرانی ہے، اندرونی ویرانی کی علامت مندر ہے۔ ہر پیکر داخلیت میں جذب ہو گیا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ آدمی کے ذہن اور دماغ سے باہر کوئی شے نہیں، شیلے نے کہا تھا:

THE EVERLASTING UNIVERSE OF THINGS-
FLOWS THROUGH THE MIND, AND ROLLS ITS
RAPID WAVES.

ملٹن کے یہاں بھی چاند، سورج، ستارے، زمین، سمندر کی گہرائی سب انسانی ذہن اور دماغ میں ہیں، بڑے رومانی فنکاروں کی پہچان یہی ہے کہ ان کی تخلیقات میں تمام خارجی عناصر داخلیت میں جذب ہوتے ہیں، انسانی ذہن اور دماغ میں پوری کائنات بسی ہوتی ہے۔

فیض کا یہ حسیاتی اور جذباتی تصور (مندر) معمولی نہیں ہے۔ یہ پورے معاشرے کی مکمل علامت ہے۔ جذباتی آمیزش سے ایک تصویر ابھری ہے جو اصل (پیکر) سے زیادہ موثر ہے۔ تاثر کی آمیزش سے اصل پیکر کا رنگ ہی بدل گیا ہے۔ اصل پیکر شاعر کے احساس اور ذہن کے سانچے میں ڈھل کر مندر کا پیکر بن گیا ہے اور مجموعی باطنی زندگی کی علامت بن کر جانے کتنی حقیقتوں کو بے نقاب کر رہا ہے۔

مندر، ایک "آرچ ٹائپ" (ARCHTYPE) ہے جسے ماہرین نفسیات کی اصطلاح میں "مدر آرچ ٹائپ" (MOTHER ARCH-TYPE) کہہ سکتے ہیں۔ اساطیر میں مدر آرچ ٹائپ کی بہت سی صورتیں ہیں۔

شاعری کی علامتوں اور حیاتی پیکروں اور ناول اور افسانوں کے مخصوص کرداروں اور مقامات مثلاً جنت، زمین، جنگل، گرجا، مندر، درگاہ، شہر، گاؤں، سمندر، درخت، سڑک، عمارت وغیرہ کا مطالعہ کرتے ہوئے "مدر آرچ ٹائپ" کو نظر انداز کرنا مشکل ہے۔ حیاتی عمل اور ردِ عمل، جذباتی عقیدت، محبت، مامتا، نفرت، رقابت، حسد اور دوسرے مختلف جذبات اور الجھنوں کا مطالعہ اور دلچسپ ہو جائے اگر ہم "مدر آرچ ٹائپ" کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ آپ اسے اساطیری جبلت کہیں یا اساطیری رجحان، حقیقت یہ ہے کہ یہ جمالیاتی شعور کی پختگی اور گہری رومانیت کی ایک بڑی پہچان ہے۔ اس نظم میں 'مندر' اور 'پروہت' کی علامتوں کے ساتھ ایک زندگی، ایک تمدن اور ایک تاریخ سامنے آتی ہے۔ تخیلی اور جذباتی فکر کو سمجھنا بھی مشکل نہیں ہے۔ ان دو علامتوں میں صدیوں کی روح ملتی ہے۔ صدیوں کی بے چین اور مضطرب روح اس رومانیت میں پوشیدہ ہے اور ساتھ ہی یہ محسوس ہوتا ہے کہ شاعر کا رجحان آدمی کے بنیادی اساطیری رجحان سے قریب ہے۔ بنیادی اساطیری فکر یہ بھی سمجھاتی ہے کہ ہر وہ شے جو آدمی کی زندگی پر اثر انداز ہوتی ہے ایک شخصی وجود رکھتی ہے۔ "پرانے مندر" کا تصور بہت اہم ہے۔ یہ زندگی اور حسن اور سچائی، فرد اور کائنات اور خالق اور مخلوق کے رشتے، تقدس، دروں بینی، جنس اور محبت، مذہبی اقتدار، نامعلوم قوتوں کے طلسم، رقص اور موسیقی، تخلیق اور دیوتا، مسرت اور غم، تصرف اور آرٹ، اور بہت سے حقائق کی مکمل اور بھرپور علامت ہے۔ اسے بے نور اور اس کی ہر دیوار کو شکستہ دیکھ کر یہ محسوس ہوتا ہے جیسے ہم نے سب کچھ کھو دیا ہے۔ 'پروہت' بھی جسم پر راکھ ملے اور ماتھے پر سیندور ملے راکھ اور سیندور کے الفاظ بھی قابلِ غور ہیں

آسمان اور شام کا تصور شاعر کے ذہن میں کس طرح پیدا ہوا ہے) سرنگوں چپ چاپ بیٹھا ہے۔ بے بس ہے۔ صرف ٹوٹتے ہوئے بے نور مندر کے تصور سے جانے کتنے تصورات پیدا ہوتے ہیں، یہ محسوس ہوتا ہے کہ زندگی کی قدریں منتشر ہو گئی ہیں۔ زندگی کی ابدی قدروں اور زندگی کے تسلسل کا تصور ٹوٹ رہا ہے، حسن اور سچائی کے پیکر ٹوٹ رہے ہیں۔ خالق اور مخلوق کے رشتے ختم ہو رہے ہیں، زندگی کا تقدس اور زندگی کی پاکیزگی ہم سے چھینی جا رہی ہے، مذہبی اقدار، دیوتاؤں کا جلال و جمال، جنس اور محبت اور رقص اور موسیقی، یہ سب دور ہوتے جا رہے ہیں (مدر آرچ ٹائپ سے ماں کا تصور پیدا ہوتا ہے جس کے وجود میں کیا نہیں ہے، سب کچھ ہے) یہ احساس ہی جان لیوا ہے۔ شاعر ان ٹوٹی ہوئی قدروں کو دیکھ کر سوچتا ہے:

اس طرح ہے کہ پسِ پردہ کوئی ساحر ہے
جس نے آفاق پہ پھیلایا ہے یوں سحر کا دام
دامنِ وقت سے پیوست ہے یوں دامنِ شام
اب کبھی شام بجھے گی نہ اندھیرا ہوگا
اب کبھی رات ڈھلے گی نہ سویرا ہوگا

المیہ کردار کی یہ مایوسی بہت اہم ہے۔ بڑی گہری اداسی ہے، جس کو ہم اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وقت کی رفتار تھم گئی ہے۔ اور شاعر کی شام کا دامن وقت کے دامن سے پیوست ہو گیا ہے۔ آخری بند

میں اس المیہ کردار کی جذباتی آرزومندی نمایاں ہوتی ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ یہ چادر ٹوٹ جائے۔ اس شام کی صبح بھی ہو، وہ صبح جو تمام بتوں کو جگاتی ہے وہ صبح جس کے پہلے اشارے پر مندروں سے پائل کی آوازیں آتی ہیں۔ صبح کا یہ تصور اس مندر کا تصور ہے جس میں ماتا ہے، دیوی اور دیوتاؤں کا جلال و جمال ہے، زندگی کا تقدس ہے، جنس اور محبت ہے، رقص اور موسیقی ہے، آرٹ اور کلچر، مذہب اور تصوّف ہے۔ حسن اور سچائی ہے، قدیم اور جدید قدروں کی ہم آہنگی اور روایات کا تسلسل ہے ابدی زندگی کا تصور اور آدمی کے مختلف پراسرار، خوبصورت اور تابناک ہیجانات ہیں۔ المیہ کردار کے باطنی اضطراب اور حسرتِ تعمیر کے درد پر غور فرمائیے۔

میں نے شروع میں کہا ہے کہ فیض کے پورے المیہ عمل میں صرف سسکتی اور ٹوٹتی ہوئی زندگی ظاہر نہیں ہوتی ہے بلکہ آرزومندی سے مستقبل کا ایک دلفریب "الیوژن" بھی پیدا ہوا ہے۔ شاعر کے جذباتی رجحان اور خارجی قدروں کی کشمکش اس نظم میں موجود ہے المیہ کردار کا دلفریب خواب یہی ہے ــــ

ع چپ کی زنجیر کٹے وقت کا دامن چھوٹے ـــــ اور:

دے کوئی سنکھ دہائی، کوئی پائل بولے
کوئی بت جاگے، کوئی سانولی گھونگھٹ کھولے

اس ذہنی تصویر میں تجربے کی ہمہ گیری پر غور فرمائیے۔

ڈاکٹر اختر احمد اختر اُرینوی تحریر فرماتے ہیں:

"فیض کی شاعری کا مزاج نرم، حریری، درد پرور، اگمد انداور متین ہے، اس کی شیرینی اور درشتی دونوں معتدل ہیں۔ اس کی رنگینی بہت مدھم ہے مگر کہیں کہیں نمایاں ہو کر شوخی ابھرتی ہے۔ اس میں ٹھہری ٹھہری، رُکی رُکی سی کیفیت ملتی ہے مگر لبریز و سرشار۔

فیض کے فن میں انفرادیت اور خاص کیفیت ملتی ہے۔ اس کے مزاج کے مخصوص خطوط، زاویئے اور دائرے ہیں۔ اس فن کی خاص فضا ہے اور اس کا ماحول کبھی اپنی دنیا آپ متعین کرتا ہے۔ رات، چاندنی، احساس، محبت، درد و گداز، انتظار، تھکن، اضمحلال، کیف و لذت کی یادیں، مدھم نالے، اور تندہ جاگا اور چونکا ہوا احساسِ حسن۔ یہ ہیں وہ عناصر جن سے فیض مخصوص فضا پیدا کرتا ہے۔ فیض کی شاعری نقش بھی ہے اور فریاد بھی۔ اس فن کار کو سفید رنگ، ملگجی چاندنی، دھندلکا، اور ان کے درمیان ابھرتا ہوا شوخ سرخ رنگ اور جسم و پیراہنِ محبوب کے رنگ و بو بہت مرغوب ہیں۔ فیض کے آرٹ میں مصوری اور

پر درد موسیقی کا امتزاج پایا جاتا ہے۔ نقشِ فریادی کا نام شاعر کے مزاج اور اس کی شاعری کی فضا کا استعارہ ہے۔"

(نقد و نظر ص ۲۰۸-۲۰۹)

ڈاکٹر موصوف کے اس تجزیے کے پیشِ نظر "سرودِ شبانہ" کی فضا دیکھیے:

نیم شب، چاند، خود فراموشی

محفلِ ہست و بود ویراں ہے

پیکرِ التجا ہے خاموشی

بزمِ انجم فسردہ ساماں ہے

آبشارِ سکوت طاری ہے   چار سو بے خودی طاری ہے

زندگی جزو خواب ہے گویا

ساری دنیا سراب ہے گویا

سو رہی ہے گھنے درختوں پر

چاندنی کی تھکی ہوئی آواز

کہکشاں نیم وا نگاہوں سے

کہہ رہی ہے حدیثِ شوقِ نیاز

ساز دل کے خموش تاروں سے
چھن رہا ہے خمار کیف آگیں

آرزو، خواب، تیرا روئے حسیں

خوبصورت رومانی نظم ہے۔ غنائی اور حسی پیکر متاثر کرتے ہیں۔ ایک فضا بن گئی ہے۔

ایک قطعہ سنیئے:

فضائے دل پہ اداسی بکھرتی جاتی ہے
فسردگی ہے کہ جاں تک اترتی جاتی ہے
فریبِ زیست سے قدرت کا مدعا معلوم
یہ ہوش ہے کہ جوانی گذرتی جاتی ہے

"ہم لوگ" میں موضوع اور لہجے پر غور کیجیے:

دل کے ایواں میں لئے گل شدہ شمعوں کی قطار
نورِ خورشید سے سہمے ہوئے اکتائے ہوئے
حسنِ محبوب کے سیّال تصور کی طرح
اپنی تاریکی کو بھینچے ہوئے لپٹائے ہوئے

غایتِ سود و زیاں، صورتِ آغاز مآل
وہی بے سود تجسس، وہی بے کار سوال
مضمحل ساعتِ امروز کی بے رنگی سے
یادِ ماضی سے غمیں، دہشتِ فردا سے نڈھال
تشنہ افکار جو تسکین نہیں پاتے ہیں
سوختہ اشک جو آنکھوں میں نہیں آتے ہیں
اک کڑا درد کہ جو گیت میں ڈھلتا ہی نہیں
دل کے تاریک شگافوں سے نکلتا ہی نہیں
اور اک الجھی ہوئی موہوم سی درماں کی تلاش
دشت و زنداں کی ہوس، چاکِ گریباں کی تلاش

"ایک منظر" ملاحظہ فرمائیے:

بام و در خامشی کے بوجھ سے چور
چاند کا دکھ بھرا فسانۂ نور
خواب گاہوں میں نیم تاریکی
مضمحل لَے ربابِ ہستی کی

آسمانوں سے جوئے درد رواں
شاہراہوں کی خاک میں غلطاں
ہلکے ہلکے سروں میں نوحہ کناں

یہ بھی سن لیجیے :

ترا جمال نگاہوں میں لے کے اٹھا ہوں
نکھر گئی ہے فضا تیرے پیرہن کی سی
نسیم تیرے شبستاں سے ہو کے آئی ہے
مری سحر میں مہک ہے ترے بدن کی سی

صبح پھوٹی تو آسماں پہ ترے
رنگِ رخسار کی پھوہار گری
رات چھائی تو روئے عالم پر
تیری زلفوں کی آبشار گری

نہ دید ہے نہ سخن اب نہ حرف ہے نہ پیام
کوئی بھی حیلۂ تسکیں نہیں اور آس بہت ہے

امید یار، نظر کا مزاج، درد کا رنگ
تم آج کچھ بھی نہ پوچھو کہ دل اداس بہت ہے

فسردہ رُخ لبوں پر اک نیاز آمیز خاموشی
تبسّم مضمحل تھا، مرمریں ہاتھوں میں لرزش تھی
وہ کیسی بیکسی تھی تیری پُرتمکیں نگاہوں میں
وہ کیا دکھ تھا تری سہمی ہوئی خاموش آہوں میں

(رخصت)

شوخیاں مضطر نگاہِ دیدۂ سرشار میں
عشرتیں خوابیدہ رنگِ غازۂ رخسار میں
سرخ ہونٹوں پر تبسّم کی ضیائیں جس طرح
یاسمن کے پھول ڈوبے ہوں مئے گلنار میں

(تصوّر)

"تنجوم" میں رومانیت کا مطالعہ کیجئے:
تنجوم کہیں چاندنی کے دامن میں
ہجوم شوق سے اک دل ہے بیقرار ابھی

خمارِ خواب سے لبریز احمریں آنکھیں
سفید رُخ پہ پریشان عنبریں آنکھیں
چھلک رہی ہے جوانی ہر اک بن مُو سے
رواں ہو برگِ گلِ تر سے جیسے سیلِ شمیم
ضیاء مہ میں دمکتا ہے رنگِ پیراہن
ادائے عجز سے آنچل اڑا رہی ہے نسیم
دراز قد کی لچک سے گداز پیدا ہے
ادائے ناز سے رنگِ نیاز پیدا ہے
اداس آنکھوں میں خاموش التجائیں ہیں
دلِ حزیں میں کئی جاں بلب دعائیں ہیں
نہ نجوم کہیں چاندنی کے دامن میں
کسی کا حسن ہے مصروف انتظار ابھی
کہیں خیال کے آباد کردہ گلشن میں
ہے اک گل کہ ہے ناواقفِ بہار ابھی

ذوق جمال کی کیفیت کو مخصوص فضا میں دیکھئے، ہم تناسب اور موزونیت سے بھی متاثر ہوتے ہیں۔ فیض کے اسی اندازِ فکر سے دو نسلیں

متاثر ہوئی ہیں۔ یہ جذبات اور احساسات کی شاعری ہے۔ دل، دماغ اور روح کی بے چینی اور شدت ظاہر ہوتی ہے۔ حقیقت اور صداقت، احساس اور جذبہ اور تخئیل کے اسی طرح پیش ہوتی ہے۔ عصری ہیجانات اور فرد کے داخلی ہیجانات کی کشمکش ملتی ہے۔ یہ رومانیت آگے چل کر اپنے دامن میں سیاست اور معاشرے کو بھی چھپالیتی ہے۔ فیضؔ ایک رومانی شاعر کی طرح اپنے آئیڈیل کو بہت عزیز رکھتے ہیں۔ اس کی مثال وہ نظمیں ہیں جن میں غمِ جاناں اور غمِ دوراں کی پہچان الگ الگ نہیں ہوتی۔ نئے نظامِ زندگی کا انتظار محبوب کا انتظار بن گیا ہے۔ ہجومِ شوق کی داستان شاعر کے رجحان کو ابھارتی ہے۔ احساسِ ناکامی بھی ہے اور احساسِ محرومی بھی۔ یادِ ماضی میں رومانیت اچھی طرح ابھری ہے۔

ویراں ہے میکدہ خم و ساغر اداس ہیں
تم کیا گئے کہ روٹھ گئے دن بہار کے

مبادا یادِ ہائے عہدِ ماضی محو ہو جائیں
یہ پارینہ فسانے موجِ ہائے غم میں کھو جائیں
مرے دل کی تہوں سے تیری صورت ڈھل کے بہ جائے
حریمِ عشق کی شمعِ درخشاں بجھ کے رہ جائے

مبادا اجنبی دنیا کی ظلمت گھیر لے تجھ کو
مری جاں اب بھی اپنا حسن واپس پھیر دے مجھ کو

"نیم شب" "چاند" "خود فراموشی" "ویرانی" "خاموشی" "پیکرِ التجا" "افسردگی" "سکوت" "بے خودی" "خواب" "سراب" "چاندنی کی تھکی ہوئی آواز" "کہکشاں کی نیم وا نگاہیں" "سازِ دل کے خاموش تار" "آرزو" "اداسی" "فریبِ زیست" "گل شدہ شمعیں" "ساعتِ امروز کی بے رنگی" "بے سود تجسس" "یادِ ماضی سے غمیں" "دہشت فزا" "کرب اور درد" "دل کے تاریک شگاف" "الجھی ہوئی موہوم سی درماں کی تلاش" "دشتِ زنداں" "ہوش" "چاکِ گریباں" ان الفاظ، تراکیب اور تصورات سے ایک مکمل رومانی فضا بنتی ہے اور اس فضا میں شاعر کا المیہ رجحان اپنے المیہ کردار کو ابھارتا ہے۔ اندرونی جذبے کا رس رچا ہوا ہے۔ شعریت بھی ہے اور تخئیلی فکر اور جذبے کی ہم آہنگی اور ہم آمیزی بھی۔ گہرے پیتھوس کو سمجھا جا سکتا ہے۔ حسی تصورات بہت اہم ہیں۔ جذباتی کیفیتوں کو مختلف حسی پیکروں میں پیش کیا گیا ہے۔ خارجی عناصر کے لئے جو رنگ منتخب کئے گئے ہیں وہ داخلی کیفیات کے رنگ ہیں۔ فیض کے حسی پیکروں اور تصورات سے زندگی کی حقیقت اور اس کے مختلف پہلوؤں کی صورتوں کا احساس گہرا ہوتا ہے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ شاعر کے تصورات ٹھوس اور گہرے ہیں اور ذہن کو ایک پیکر سے دوسرے پیکر تک لے جانے میں ان ہی تاثرات کو دخل ہے۔

حسیاتی پیکروں سے آدمی جب تک ذہنی اور جذباتی طور پر متاثر

اور قائل نہ ہو، ان پیکروں کی اہمیت نہیں رہتی، ذہنی اور جذباتی طور پر متاثر اور قائل نہ ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ شاعر کے تاثرات ٹھوس اور گہرے نہیں ہیں۔ فیض نے حسی پیکروں سے پوری فضا کی معنوی کیفیت کو مجسم کر کے پیش کر دیا ہے۔ "سرودِ شبانہ" میں فضا کی معنوی کیفیت مجسم نظر آتی ہے۔ فضا کی معنوی کیفیت "تنہائی" میں دیکھیے۔ یہ نظم فیض کی ایک نمائندہ نظم ہے۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اردو شاعری میں اپنی نوعیت کی واحد نظم ہے۔

پھر کوئی آیا دلِ زار، نہیں کوئی نہیں
راہرو ہوگا کہیں اور چلا جائے گا
ڈھل چکی رات بکھرنے لگا تاروں کا غبار
لڑکھڑانے لگے ایوانوں میں خوابیدہ چراغ
سو گئی راستہ تک تک کے ہر اک راہگذر
اجنبی خاک نے دھندلا دیئے قدموں کے سراغ
گل کرو شمعیں، بڑھا دو مے و مینا و ایاغ
اپنے بے خواب کواڑوں کو مقفل کر لو
اب یہاں کوئی نہیں، کوئی نہیں آئے گا

مختلف خارجی نقوش ہیں، ان نقوش کے حسی تصورات سے تنہائی کا

تصوّر ابھرتا ہے۔ تنہائی جدید شاعری کا ایک اہم موضوع ہے۔ اس چھوٹی سی نظم میں اس پورے عہد کے ذہنی رویئے اور جذباتی بے اطمینانی کی پہچان ہوتی ہے۔ شاعر کے لہجے کا پینتھوس متاثر کرتا ہے۔ تنہائی کا احساس شدید ہے۔ زندگی کی مایوسی اور فرد کی مسلسل ناکامیوں نے یہ احساس پیدا کیا ہے۔ جب بھی کوئی خواب ٹوٹتا ہے، تنہائی کا احساس بڑھ جاتا ہے۔ آدمی سماج میں رہتے ہوئے خود کو تنہا محسوس کرنے لگتا ہے۔ تنہائی فیض کا محبوب موضوع ہے۔ تاریکی اور اندھیرے میں زندگی کے نقوش کو ٹٹولنے والا تنہائی کے احساس میں ڈوبا رہتا ہے۔ حسین خواب ٹوٹ جاتے ہیں اور فیض کی شاعری کا المیہ کردار خود کو تنہا محسوس کرتا ہے۔ زندگی کی تلخیاں اور مایوسیاں اور معاشرے کی ناہمواریاں، بھی تنہائی کا احساس پیدا کرتی ہیں۔ محبت کا اعلیٰ تصوّر ہو یا کسی عقیدے کا اعلیٰ تصور، جب زندگی اور معاشرے کی ناہمواریاں اور کشمکش حیات سے اس تصور کو ٹھیس لگتی ہے تو اس کا شدید ردّ عمل ہوتا ہے۔ فیض کی شاعری میں یہ ردّ عمل مختلف صورتوں میں ظاہر ہوا ہے۔

آپ اسے جسم کی بھوک کہیئے یا روح کی پیاس، یہ تشنگی کا گہرا احساس ہی ہے جو ایسے تصور کو جنم دیتی ہے، اداسی، مایوسی، سوز اور پینتھوس کا پیدا ہونا لازمی ہے۔ اس نظم میں یہ تمام باتیں موجود ہیں۔ یہ تشنگی ایک فرد کی بھی ہے، اور پورے معاشرے کی بھی۔ اندرونی ویرانی کی پہچان ہوتی ہے۔ نظم میں گہرا تاثر ہے پیکر تراشی کی حسن کاری ہے۔ نو مصرعوں سے ایک فضا بن گئی ہے۔ روح کی تنہائی اور روح کی پیاس اور تشنگی کی شدت کا اندازہ کرنا مشکل ہے۔ اس مختصر نظم میں چند لمحے سمٹ کر ابدی لمحے بن گئے ہیں۔ شاعر کو انتظار ہے، ہلکی سی آہٹ

پر وہ چونک جاتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ جس کا انتظار ہے شاید وہ آرہا ہے، پہلے مصرعے میں فیض نے انتظار کے جانے کتنے لمحوں کو سمیٹ کر ایک جاوداں لمحہ بنادیا ہے۔

پھر کوئی آیا، دل زار نہیں کوئی نہیں

اس ایک مصرعے میں امید بھی ہے اور ناامیدی بھی۔ انتظار میں امید اور مایوسی دونوں کی لہریں ایک ساتھ اٹھتی ہیں:

راہرو ہوگا کہیں اور چلا جائے گا

ناامیدی اور مایوسی نے امید کو شکست دے دی ہے، اس کے بعد شاعر ماحول اور فضا کا جائزہ لیتا ہے:

ڈھل چکی رات بکھرنے لگا تاروں کا غبار
لڑکھڑانے لگے ایوانوں میں خوابیدہ چراغ
سو گئی راستہ تک تک کے ہر اک راہگذر
اجنبی خاک نے دھندلا دیئے قدموں کے سراغ

تنہائی میں مایوسی کی یہ کیفیت عجیب طرح اثر کرتی ہے، مایوسی بڑھتی جاتی ہے۔ رات کے ڈھلنے سے اور تاروں کے بکھرنے سے انتظار کے لمحوں کے ختم ہو جانے کا احساس پیدا کیا گیا ہے۔ اس طرح خوابیدہ چراغ کے لڑکھڑانے، راستہ تک تک کر راہگذر کے سو جانے اور قدموں کے سراغ کے دھندلانے سے اس تاثر کو اور گہرا کیا گیا ہے۔ جب مایوسی حد سے زیادہ بڑھ جاتی ہے تو ایک چیخ سی سنائی دیتی ہے:

گل کرو شمعیں، بڑھا دو مے و مینا و ایاغ
اپنے بے خواب کواڑوں کو مقفل کر لو

جو حسی پیکر حس باصرہ سے تعلق رکھتے ہیں وہ زیادہ اہم ہیں۔ اس نظم کے تمام حسی تصورات سے جذب و جنوں اور آشفتگی اور انتظار اور تنہائی کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ یہ مہذب آرزومندی اور بینائی کی شکست کی تصویر ہے۔ رومانی تخئیل قابل غور ہے۔ المیہ رجحان اور لہجے کا پیکر شاعر کے مزاج اور شخصیت کو سمجھا رہا ہے۔ اس نظم کے مجموعی آہنگ میں لفظوں کی آوازوں کو بہت دخل ہے آخری مصرعے سے گہری مایوسی کا اندازہ کیجیے:

اب یہاں کوئی نہیں۔ کوئی نہیں آئے گا

"کوئی نہیں" "کوئی نہیں" کی تکرار بہت اہم ہے۔ اس تکرار کا اثر بہت ہوتا ہے۔ شاعر کی جذباتی اور نفسیاتی کیفیت اسی تکرار سے معلوم ہوتی ہے۔ داخلی ہیجان کو جذب کرنے کی یہ بڑی فنکارانہ کوشش ہے۔ شاعر اپنے محبوب کا منتظر ہو یا نئی دنیا کا، یہ بات واضح ہے کہ وہ حد درجہ مایوس ہے اور اسے یقین ہے کہ جس کا اسے انتظار ہے وہ ان لمحوں میں نہیں آئے گا۔ جب قافیے کی پابندی ہٹ جاتی ہے تو ہیجان کے سمٹ جانے کا احساس زیادہ ہو جاتا ہے۔

یہ رومانی شاعری، تنہائی "یاد" اور "انتظار" کی شاعری ہے۔
"یاد" فیض کی ایک نہایت ہی دلفریب رومانی نظم ہے۔

دشتِ تنہائی میں اے جانِ جہاں لرزاں ہیں

تیری آواز کے سائے، ترے ہونٹوں کے سراب

دشتِ تنہائی میں، دوری کے خس و خاک تلے

کھِل رہے ہیں، ترے پہلو کے سمن اور گلاب

اُٹھ رہی ہے کہیں قربت سے تری سانس کی آنچ

اپنی خوشبو میں سلگتی ہوئی مدھم مدھم

دُور ـــــ افق پار، چمکتی ہوئی قطرہ قطرہ

گِر رہی ہے تری دلدار نظر کی شبنم

اس قدر پیار سے اے جانِ جہاں رکھا ہے

دل کے رخسار پہ اس وقت تری یاد نے ہات

یوں گماں ہوتا ہے، گرچہ ہے ابھی صبحِ فراق

ڈھل گیا ہجر کا دن، آ بھی گئی وصل کی رات

تنہائی میں کسی کی یاد نے کیسی فضا پیدا کر دی ہے۔ قربت کا احساس کیا ہے۔ ذہنی اور حسی تصویروں سے ایک زندہ پیکر محسوس ہوتا ہے۔ شاعر ماحول کی گھٹن، تاریکی اور افسردگی سے نکل کر تخیل کی دنیا میں آ گیا ہے۔ کسی کی آواز کے سائے اور ہونٹوں کے سراب میں، پہلو کے سمن اور گلاب اور سانس کی آنچ اور اس کی خوشبو میں شاعر گم ہو گیا ہے۔ یہ ذہنی گریز شاعر کی رومانیت ہی تو ہے

جذباتی فکر کی یہ عمدہ مصوری ہے۔ شاعر کے لہجہ میں شدتِ احساس کی وجہ سے عجیب کیفیت ہے جس سے امید اور آرزومندی اور داخلی تحریک کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ "دشتِ تنہائی" "آواز کے سائے" "ہونٹوں کے سراب" "پہلو کے سمن اور گلاب" "سانس کی آنچ اپنی خوشبو میں سلگتی ہوئی مدھم مدھم" "دل کے رخسار" "یاد کا ہاتھ" ــــــــ حسی تصویر نگاری اور امیجز کی معنویت کو ان سے سمجھا جاسکتا ہے۔ تاثراتی مصوری کی ایک عمدہ مثال ہے۔ اس تاثراتی مصوری اور حسی تصویر نگاری کو سمجھنے کے لیے شخصیت کے سوز و گداز، مزاج کی کیفیت اور انفرادی احساس کے آہنگ، پر بھی غور کرنا چاہیئے۔

چند اور مثالیں پیش کرتا ہوں:

رات یوں دل میں تری کھوئی ہوئی یاد آئی
جیسے ویرانے میں چپکے سے بہار آجائے
جیسے صحراؤں میں ہولے سے چلے بادِ نسیم
جیسے بیمار کو بے وجہ قرار آجائے

ــــــــ

ہیں دل فگار نہیں تو ستم شعار نہیں
بہت دنوں سے مجھے تیرا انتظار نہیں
ترا ہی عکس ہے ان اجنبی بہاروں میں
جو ترے لب، ترے بازو، ترا کنار نہیں

کبھی کبھی یاد میں ابھرتے ہیں نقشِ ماضی مٹے مٹے سے
وہ آزمائش دل و نظر کی، وہ قربتیں سی، وہ فاصلے سے

تم آئے ہو، نہ شبِ انتظار گذری ہے
تلاش میں ہے سحر، بار بار گذری ہے

تمہاری یاد کے جب زخم بھرنے لگتے ہیں
کسی بہانے تمہیں یاد کرنے لگتے ہیں

میری تنہائیوں پہ شام رہے
حسرتِ دید ناتمام رہے
دل میں بیتاب ہے صدائے حیات
آنکھ گوہر نثار کرتی ہے
آسمان پر اداس ہیں تارے
چاندنی انتظار کرتی ہے
آ کہ تھوڑا سا پیار کرلیں ہم
زندگی زرنگار کرلیں ہم

تنہائی میں کیا کیا نہ تجھے یاد کیا ہے

کیا کیا نہ دلِ زار نے ڈھونڈی ہیں پناہیں

آنکھوں سے لگایا ہے کبھی دستِ صبا کو

ڈالی ہیں کبھی گردنِ مہتاب میں باہیں

'نوحہ' سنیئے:

مجھ کو شکوہ ہے مرے بھائی کہ تم جاتے ہوئے

لے گئے ساتھ میری عمرِ گذشتہ کی کتاب

اس میں تو میری بہت سی قیمتی تصویریں تھیں

اس میں بچپن تھا میرا اور میرا عہدِ شباب

اس کے بدلے میں مجھے تم دے گئے جاتے جاتے

اپنے غم کا یہ دمکتا ہوا خوں رنگ گلاب

کیا کروں بھائی یہ اعزاز میں کیونکر پہنوں

مجھ سے لے لو میری سب چاک قمیصوں کا حساب

آخری بار ہے، لو مان لو اک یہ بھی سوال

آج تک تم سے میں لوٹا نہیں مایوس جواب

آکے لے جائیے تم اپنا دمکتا ہوا پھول
مجھ کو لوٹا دو مری عمرِ گذشتہ کی کتاب

دل میں اب یوں ترے بھولے ہوئے غم آتے ہیں
جیسے بچھڑے ہوئے کعبے میں صنم آتے ہیں
اور کچھ دیر نہ گذرے شبِ فرقت سے کہو
دل بھی کم دُکھتا ہے، وہ یاد بھی کم آتے ہیں

کر رہا تھا غمِ جہاں کا حساب
آج تم یاد بے حساب آئے

اس طرح اپنی خامشی گونجی
گویا ہر سمت سے جواب آئے

ماضی پہ ندامت ہو تمہیں یا کہ مسرت
خاموش پڑا سوئے گا داماندۂ الفت (آخری خط)

مری روح اب بھی تنہائی میں تجھ کو یاد کرتی ہے
ہر اک تارِ نفس میں آرزو بیدار ہے اب بھی

"انتظار" سنئے :

گذر رہے ہیں شب و روز تم نہیں آتیں
ریاضِ زیست ہے آزردہ بہار ابھی
مرے خیال کی دنیا ہے سوگوار ابھی
جو حسرتیں ترے غم کی کفیل ہیں پیاری
ابھی تلک مری تنہائیوں میں بستی ہیں
طویل راتیں ابھی تک طویل ہیں پیاری
اداس آنکھیں ابھی انتظار کرتی ہیں
بہارِ حسن پہ پابندیِ جفا کب تک
یہ آزمائش صبر گریز پا کب تک؟
قسم تمہاری بہت غم اٹھا چکا ہوں میں
غلط تھا دعویٰ صبر و شکیب آجاؤ
قرارِ خاطر بے تاب تھک گیا ہوں میں

نہ جانے کب سے امیدوار بیٹھا ہوں
اک ایسی راہ پہ جو تیری رہگذر بھی نہیں

ماضی میں جو مزا مری شام و سحر میں تھا
اب وہ فقط تصور شام و سحر میں ہے

بزم خیال میں ترے حسن کی شمع جل گئی
درد کا چاند بجھ گیا ہجر کی رات ڈھل گئی

جب تجھے یاد کرلیا صبح مہک مہک اٹھی
جب ترا غم جگا لیا، رات مچل مچل گئی

خیالِ یار، کبھی ذکر یار کرتے رہے
اسی متاع پہ ہم روزگار کرتے رہے
وہ دن کہ کوئی بھی جب وجہ انتظار نہ تھی
ہم ان میں تیرا سوا انتظار کرتے رہے

کب یاد میں تیرا ساتھ نہیں، کب ہاتھ میں تیرا ہاتھ نہیں
صد شکر کہ اپنی راتوں میں اب ہجر کی کوئی رات نہیں

دل ناامید تو نہیں ناکام ہی تو ہے
لمبی ہے غم کی شام مگر شام ہی تو ہے

سبزہ سبزہ سوکھ رہی ہے پھیکی، زرد دوپہر
دیواروں کو چاٹ رہا ہے تنہائی کا زہر
دور افق تک گھٹتی بڑھتی اٹھتی گرتی رہتی ہے
کہر کی صورت بے رونق دردوں کی گدلی لہر

(اے روشنیوں کے شہر)

"دریچہ" "اے حبیب عنبر دست" "ملاقات" "درد آئے گا دبے پاؤں" "شاہراہ" "شام" "منظر" "ہر جگہ تنہائی" "انتظار" "خاموشی" اور یاد کے لمحے ہیں۔ "قید تنہائی" کی یہ تصویر بھی دیکھیے:

دور آفاق پہ لہرائی کوئی نور کی لہر
خواب ہی خواب میں بیدار ہوا درد کا شہر
خواب ہی خواب میں بیتاب نظر ہونے لگی
عدم آباد جدائی میں سحر ہونے لگی

کاسۂ دل میں بھری اپنی صبوحی میں نے
گھول کر تلخیٔ دیروز میں امروز کا زہر

دور آفاق پہ لہرائی کوئی نور کی لہر
آنکھ سے دور کسی صبح کی تمہید لئے
کوئی نغمہ، کوئی خوشبو، کوئی کافر صورت
عدم آبادِ جدائی میں مسافر صورت
بے خبر گذری، پریشانیٔ امید لئے
گھول کر تلخیٔ دیروز میں امروز کا زہر
حسرتِ روزِ ملاقات رقم کی میں نے
دیس پردیس کے یارانِ قدح خوار کے نام
حسنِ آفاق، جمالِ لب و رخسار کے نام

ایک نظم اور ملاحظہ فرمائیے:

یاد کی راہ گذر جس پہ اسی صورت سے
مدتیں بیت گئی ہیں تمہیں چلتے چلتے

ختم ہو جائے جو دو قدم اور چلو
موڑ پڑتا ہے جہاں دشتِ فراموشی کا
جس سے آگے نہ کوئی میں ہوں نہ کوئی تم ہو
سانس تھامے ہیں نگاہیں کہ نہ جانے کس دم
تم پلٹ آؤ، گزر جاؤ یا مڑ کر دیکھو

گرچہ واقف ہیں نگاہیں کہ یہ سب دھوکا ہے
گر کہیں تم سے ہم آغوش ہوئی پھر سے نظر
پھوٹ نکلے گی وہاں اور کوئی راہ گذر
پھر اسی طرح جہاں ہوگا مقابل پیہم
سایۂ زلف کا اور جنبشِ بازو کا سفر

دوسری بات بھی جھوٹی ہے کہ دل جانتا ہے
یاں کوئی موڑ، کوئی دشت کوئی گھاٹ نہیں
جس کے پردے میں مرا ماہِ رواں ڈوب سکے
تم سے چلتی رہے یہ راہ، یونہی اچھا ہے
تم نے مڑ کر بھی نہ دیکھا تو کوئی بات نہیں

"تنہائی" ایک کردار بن کر سامنے آتی ہے:

آج تنہائی کسی ہمدمِ دیریں کی طرح
کرنے آئی ہے مری ساقی گری شام ڈھلے
منتظر بیٹھے ہیں ہم دونوں کہ مہتاب ابھرے
اور ترا عکس جھلکنے لگے ہر سائے تلے

فیض کی رومانیت اور ان کی شاعری کے المیہ کردار سے ذہنیت کے تدریجی مزاج کو سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے۔ شخصیت اور مزاج کی مختلف کیفیتیں اور ذہنی افکار اور احساس اور جذبے کی تیزی اور گرمی، پورے معاشرے کے ہیجانات کو ان سے سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ یہ نظموں کے انفرادی شعور کی ایک اہم مثال ہے۔ تنہائی کی لذت اور درد و کرب میں ایک بیدار شعور کی پہچان ہوتی ہے۔ فیض کی نظموں میں جو حسن کاری ہے وہ شعور کی پاکیزگی اور پختگی اور تجربے کی موزونیت اور ہم آہنگی کی وجہ سے ہے۔ ہر جگہ ہارمونی اور سیمٹری ہے۔ جذباتی قدریں اسی طرح حقیقی انفرادیت کی مظہر بنتی ہیں۔ جو مثالیں پہلے پیش کی گئی ہیں، ان سے رومانی شاعر کے گریز کے عمل کی پہچان ہوتی ہے۔ ماضی کے اوراق سے اس کی گہری دلچسپی (مجھ کو لوٹا دو مری عمرِ گذشتہ کی کتاب) بھی قابلِ غور ہے۔ خاموشی کی گونج (گویا ہر سمت سے جواب آئے) تنہائی میں لذت کی تڑپ (میری روح اب بھی تنہائی میں تجھ کو یاد کرتی ہے) ٹھنڈی راتوں کا احساس اور اداس آنکھوں کا انتظار، تصور میں ماضی کی شام دیکھ، کسی کی

یاد میں بجنے کی کئی چیزوں کا تصور، صبح کا انتظار، یہ تمام باتیں شاعر کی رومانیت کو سمجھاتی ہیں۔ محبوب کا انتظار نئی قدروں اور نئی زندگی کا انتظار بن گیا ہے۔ اس عہد میں ایک المیہ کردار اس سے زیادہ کیا کہہ سکتا ہے:

کاٹے دل میں بھری اپنی صبوحی میں نے
گھول کر تلخی دیروز میں امروز کا زہر

اور —

دور آفاق پہ لہرائی کوئی نور کی لہر
آنکھ سے دور کسی صبح کی تمہید لیے

یہ شاعری درحقیقت اس شہر کی کہانی ہے جو ایک شہر آرزو بھی ہے۔

فیض نے تغزل کی روایت سے بہت فائدہ اٹھایا ہے۔ اسے اپنے شعور میں رچا بسایا ہے۔ ان کی نظموں کی شعریت اور صناعی اور ان لفظوں کے سوز و گداز، دروں بینی اور داخلیت کا احساس ہوتا ہے۔ انہوں نے پرانی علامات کو نئے معنوں میں استعمال کیا ہے اور استعاروں کی ایک دلفریب، خوبصورت اور روشن دنیا بنائی ہے۔ نئی ترکیبیں بھی ڈھالی ہیں خوش آہنگ استعارات کے سہارے تجربے احساسات اور جذبات سے ہم آہنگ ہو جاتے ہیں۔ فیض کی اپنی ڈکشن ہے جو وجدانی ادراک اور جذبات کے آہنگ کی تخلیق کرتا ہے۔ علامتوں اور ترکیبوں، پیکروں اور تصویروں کی خیال انگیزی اور اشاراتی زرخیزی اس عہد کی اردو شاعری میں اپنا جواب نہیں رکھتی۔ شدید داخلیت، اشاریت اور اس خوابناکی میں تقلب کی

بیداری کی پہچان ہو جاتی ہے۔ میں نے اسی کو شروع میں جذباتی بیداری کہا ہے۔ ان لفظوں میں لہجے کی تازگی بھی ہے اور حسی پیکروں کی ندرت بھی۔ استعاروں کی معنی خیزی، صوری ترکیب اور فنی تکمیل بھی گہرے طور پر متاثر کرتی ہے۔ فیض کی نظموں میں مصوری اور موسیقی کا نہایت ہی حسین امتزاج ملتا ہے۔ فیض کی صنم گری کے بارے میں ڈاکٹر اختر اورینوی نے درست فرمایا ہے کہ فیض کی شاعری میں صنم گری عموماً عورت کے تصور سے وابستہ ہوتی ہے۔ تشبیہیں، استعارے اور معاملات اسی سانچے میں ڈھلتے ہیں۔ مثلاً زیست کی رانی کا جھومر، امن کی دیوی کا کنگن وغیرہ۔ میں نے بھی شروع میں کہا تھا کہ فیض تجربوں کے معاملے میں عورت کے پیکر کو اپنے تصور سے علیحدہ نہیں کر سکتے۔ اس سے ان کی نظمیں اور زیادہ خوبصورت بن گئی ہیں۔ فیض کا مزاج رومانی ہے اور ان کے تمام بنیادی تصورات عشقیہ ہیں۔ غم دوراں کا تصور بھی اسی رومانی مزاج کی پیداوار ہے۔ وہ "اس شوخ کے آہستہ سے کھلتے ہوئے ہونٹ" کو کسی منزل پر بھول نہیں سکتے۔ تخئیل کے دھندلکوں میں کسی کے لب، رخسار اور آنچل کی پہچان ہوتی رہتی ہے۔ فیض نے انقلابی اور آتشیں لہجہ پیدا کرنا چاہا ہے اور اپنے ایوان سے نکلنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن ایسے لمحوں کی شاعری میں انفرادیت قائم نہ رہ سکی ہے۔ "ایرانی طلبا کے نام" "سر مقتل" "مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ" "سوچ" "میرے ندیم" "آجاؤ افریقہ" "پیکنگ" "سنکیانگ" "تم یہ کہتے ہو اب کوئی چارہ نہیں" "آج بازار میں پا بجولاں چلو" ان کی نہایت ہی کمزور نظمیں ہیں۔ اندرونی کرب نغمہ نہیں بن سکا ہے۔ ورنہ تخلیقی لمحے کی لذت میں تخلیل نہ ہو سکا ہے۔ وہ روحانی کرب نہیں ملتا جو ان کی

دوسری نظموں میں ہے۔ ترنم کی طرح ہر اک آنکھ کو بیدار رکھنے کا مشورہ نہیں ہے۔ تجربوں کو ایک ایک حس میں جذب کرنا ضروری تھا، ظاہر ہے لہجے پر اس کا اثر ہوگا۔

یہ اپنے دور کی مشہور نظم ہے:

مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ

میں نے سمجھا تھا کہ تو ہے تو درخشاں ہے حیات

ترا غم ہے تو غمِ دہر کا جھگڑا کیا ہے

تیری صورت سے ہے عالم میں بہاروں کو ثبات

تیری آنکھوں کے سوا دنیا میں رکھا کیا ہے

تو جو مل جائے تو تقدیر نگوں ہو جائے

یوں نہ تھا میں نے فقط چاہا تھا یوں ہو جائے

اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا

راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا

اَن گنت صدیوں کے تاریک بہیمانہ طلسم

ریشم و اطلس و کمخواب میں بنوائے ہوئے

جا بجا بکتے ہوئے کوچہ و بازار میں جسم

خاک میں لتھڑے ہوئے خون میں نہلائے ہوئے

جسم نکلے ہوئے امراض کے تنوروں سے

پیپ بہتی ہوئی گلتے ہوئے ناسوروں سے

لوٹ جاتی ہے اِدھر کو بھی نظر کیا کیجئے

اب بھی دلکش ہے ترا حسن مگر کیا کیجئے

اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا

راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا

مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ

جذباتی آہنگ تو موجود ہے لیکن جذبات کی پیش کش نہیں ہے۔ نفسیاتی دروں بینی نہیں ہے۔ "یوں نہ تھا میں نے فقط چاہا تھا یوں ہو جائے" —— عجیب سطحی مصرعہ ہے، یہاں آتے ہی "تاثر ختم ہو جاتا" ہے۔ اٹھان اچھی تھی لیکن تاثر کے ختم ہونے میں دیر نہیں لگتی۔ اس کے بعد تخیلی فکر دم توڑ دیتی ہے۔ "بکتے ہوئے کوچہ و بازار میں جسم۔ خاک میں لتھڑے ہوئے خون میں نہلائے ہوئے" امراض کے تنوروں سے نکلے ہوئے جسم اور گلتے ہوئے ناسوروں سے بہتی ہوئی پیپ کے ساتھ نظم کا حسن ختم ہو جاتا ہے۔ اپنے وقت کی یہ مقبول نظم آج کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ اس موضوع پر دوسرے کئی شاعروں نے طبع آزمائی کی اور ان کا اور زیادہ برا حشر ہوا۔ فیض کی ایسی نظموں میں داخلی کشمکش، سلگتی ہوئی کیفیت، جذبے کی گہرائی اور جذبات کی پیش کش نہیں ہے۔ المیہ رجحان تو ہے لیکن المیہ کی تابناکی اور اس کا حسن نہیں ہے۔ غریب محبوب کا کردار گم ہو کر رہ گیا ہے۔ متحرک امیجری نہیں ملتی۔ وہ آہنگ اور وہ آواز نہیں ہے جس سے فیض

کی پہچان ہوتی ہے۔ وہ تصور جو فیض کے جمالیاتی ذوق کا اہم جزو تھا "نقش فریادی" کے دوسرے حصے میں گم ہو گیا ہے۔ اس حاوی رجحان کی پہچان دوسری نظموں میں بھی ہوتی ہے۔ اپنی نظم "سوچ" میں انہوں نے ہمیں حد درجہ مایوس کیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ غم دوراں کی شاعری ہے، ہم سوچتے ہیں کہ یہ شاعری ہے تو کیسی شاعری ہے جس میں نہ روح کی بے چینی ہے اور نہ اندرونی اور داخلی کیفیتوں کا بیان، نہ لفظوں کا صوتی آہنگ ہے اور نہ شاعری کی معنوی کیفیت۔

"رقیب سے" ایک اچھی نظم ہوتے ہوتے رہ گئی ہے۔ جب یہ نظم "ہمایوں" (فروری ۱۹۳۸ء) میں شائع ہوئی تو بہت کم مقبول ہوئی۔ فراق گورکھپوری نے تحریر فرمایا ہے۔

"میں بہت کم اشعار غزلوں یا نظموں کے متعلق یہ احساس کرتا ہوں کہ میرے دل و دماغ کا چور نکلا لیکن یہ نظم ایسی ہی نظم تھی۔ اردو کی عشقیہ شاعری میں اب تک اتنی پاکیزہ اتنی چٹیلی اور اتنی دور رس اور مفکرانہ نظم وجود میں نہیں آئی، نظم نہیں ہے بلکہ جنت اور دوزخ کی وحدت کا راگ ہے، شیکسپیئر، گوئٹے، کالیداس اور سعدی بھی اس سے زیادہ رقیب سے کیا کہتے ...... عشق اور انسانیت کے لطیف اور اہم ربط کو سمجھنا ہو تو یہ نظم دیکھئے۔"

(اردو کی عشقیہ شاعری ص ۶۴-۶۵)

میں نہیں جانتا کہ شیکسپیئر، گوئٹے، کالیداس اور سعدی کی شاعری میں رقیب کے تصورات کیا ہیں، یا یہ فن کار رقیب سے کچھ کہتے تو کیا کہتے۔ لیکن اسے مفکرانہ نظم کہتے ہوئے یقیناً جھجکتا ہوں۔ جنت اور دوزخ کی وحدت کا راگ کہاں ہے گو یہ ایک مخصوص جذبے کا معمولی اظہار ہے۔ ابتدا ان بہت اچھی

ہے۔ تو دس اشعار کے بعد مقصدیت غالب آجاتی ہے، جہاں یہ بات واضح ہو
جاتی ہے "جاجزی بیکھی غریبوں کی حمایت بیکھی" نظم کا سارا تاثر ختم ہو جاتا ہے
مصائب، سرد آہیں، اُرتے ہوئے بیکس، بہتا ہوا غریبوں کا لہو۔ یہی باتیں
ملتی ہیں۔ ہم اس دور کی ذہنی تبدیلیوں کی قدر کرتے ہیں، ایسے موضوعات کی
معنویت سمجھتے ہیں، لیکن شاعری میں ایسی چیخ اور ایسی وحشت اور ایسے تشدد
اور جنون کے تجربوں کے بارے میں بھی بہت کچھ سوچتے ہیں۔ اشاریت تہہ داری
اور تخئیل، جذبات کی تہذیب، اور داخلی عمل اور ردِ عمل، حسیات کیفیات۔
اور عقل، جذبہ احساس اور فکر اور عقیدے کی وحدت، ان تمام باتوں پر
نظر جاتی ہے۔ کسی بلیغ اور گہری حقیقت کا احساس شاعری میں اس طرح نہیں
دلایا جاتا۔

ہم نے مانا جنگ کڑی ہے	سر پھوٹیں گے خون بہے گا
خون میں غم بھی بہہ جائیں گے	ہم نہ رہیں غم بھی نہ رہے گا

یا :—

جب کبھی بکتا ہے بازار میں مزدور کا گوشت
شاہراہوں پہ غریبوں کا لہو بہتا ہے

یا :—

اب کوئی جنگ نہ ہوگی مے و ساغر لاؤ
خون لٹانا نہ کبھی اشک بہانا ہوگا

دھرتی دھڑک رہی ہے مرے ساتھ ایفریقا
دریا تھرک رہا ہے تو بن دے رہا ہے تال

"ایسی نظموں میں جذباتی رچاؤ اور فکری جستجو کا فقدان ہے۔ ایک رومان پسند شاعر سیاسی فلسفے کو سنبھالنے کی کوشش کر رہا ہے۔ فیض نے اپنے اس انداز سے ایک پوری نسل کو متاثر کیا ہے اور یہ اثر اچھا نہیں ہوا ہے۔ فیض کا بنایا ہوا ایک سانچہ (سیاسی۔ رومانی سانچہ) ل گیا اور شاعری فکر اس میں ڈھلنے لگی۔ جذبے کی گہری اور عالمگیر صورت نہیں ملتی اس لئے کہ شعوری کوشش ہی اہم ہے، جذبے کی غیر شعوری صورت نہیں ملتی۔ فیض کے کلام کا مطالعہ کرتے ہوئے ہم شکست و ریخت کے کھوکھلے جذبے کو بدنصیبی سے نظر انداز بھی نہیں کر سکتے"۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ فیض کی فکر میں توانائی اور دلکشی پیدا ہوئی ہیں اور انہوں نے محبوب کا ایک تجریدی تصور دیا ہے اور احساسِ جمال کو کئی سمتوں سے بیدار کرنے کی کوشش کی ہے۔

پچھلی رومانی نظموں میں "خدا وہ وقت نہ لائے ...." "انتہائے کار" "انجام" "آخری خط" "میری جان اب بھی اپنا حسن واپس پھیر دے مجھ کو" معمولی نظمیں ہیں، تاثر کی کمی ہے، زبان و بیان کی خامیاں ہیں، شتر گربگی ہے، غلط قافیے ہیں، (آرزوئیں اور التجائیں) فرسودہ روایتی خیالات ہیں۔ ظاہر ہے یہ ابتدائی رومانی اور عشقیہ نظمیں ہیں اور ان میں ایسی خامیوں کا پایا جانا تعجب کی بات نہیں ہے۔ "سرودِ شبانہ" "ما نہ تجوم" "یاس" "آج کی رات" "تین منظر" "ایک رہگذر پر" اپنے موضوعات اور اپنے نغمہ اور آہنگ کے اعتبار سے اچھی نظمیں ہیں۔ نفاست اور لطافت تو ہے،

لیکن تجربے بہت معمولی ہیں۔ "موضوعِ سخن" اچھی اور کامیاب نظم کہی جا سکتی ہے۔ "اے دلِ بیتاب ٹھہر" کی صنم کاری اور فضابندی بھی متاثر کرتی ہے مجھے ان کی نظم "ایک رہگذر پر" بھی بہت پسند ہے۔ آپ بھی دیکھئے کیسی تصویر ہے، جوش ملیح آبادی کا اثر نمایاں ہے:

وہ جس کی دید میں لاکھوں مسرتیں پنہاں
وہ حسن جس کی تمنا میں جنتیں پنہاں
ہزار فتنے تہ پائے ناز، خاک نشیں
ہر اک نگاہ خمار شباب سے رنگیں
شباب جس سے تخیل پہ بجلیاں برسیں
وقار جس کی رفاقت کو شوخیاں ترسیں
ادائے لغزش پا پر قیامتیں قرباں
بیاضِ رخ پہ سحر کی صباحتیں قرباں
سیاہ زلفوں میں وارفتہ نکہتوں کا ہجوم
طویل راتوں کی خوابیدہ راحتوں کا ہجوم
وہ آنکھ جس کے بناؤ پہ خالق اترائے
زبانِ شعر کو تعریف کرتے شرم آئے

وہ ہونٹ فیض سے جن کے بہار لالہ فروش
بہشت و کوثر و تسنیم و سلسبیل بدوش
گداز جسم قبا جس پہ سج کے ناز کرے
دراز قد جسے سرو سہی نماز کرے
غرض وہ حسن جو محتاجِ وصف و نام نہیں
وہ حسن جس کا تصوّر بشر کا کام نہیں

یہ ہے فیض کا محبوب۔ آج بھی ان کے لاشعور میں حسن اور محبوب کا یہی پیکر ہے۔ انھوں نے یہ تمام خصوصیتیں اس پیکر میں دیکھی ہیں جو نئی زندگی کا پیکر ہے، تنہائی میں وہ اسی پیکر اور تخئیل سے تراشے ہوئے اسی کا فر کا انتظار کرتے رہے ہیں۔ اور یہ حالت ہو جاتی ہے:

فریبِ آرزو کی سہل انگاری نہیں جاتی
ہم اپنے دل کی دھڑکن کو تری آوازِ پا سمجھے

"زنداں کی ایک شام" "اے روشنیوں کے شہر" "دست تہ سنگ آمدہ" "ہم جو تاریک راہوں میں" "قید تنہائی" اور دوسری نظموں میں اس پیکرِ حسن کے تصور میں بڑی معنویت پیدا ہو گئی ہے۔ "نقش فریادی" کے محبوب کو وہ بھولتے نہیں:

تمہارے ہاتھ پہ ہے تابشِ حنا جب تک
جہاں میں باقی ہے دلداریٔ عروسِ سخن

تمہارا دم ہے تو دمساز ہے ہوائے وطن

اگرچہ تنگ ہیں اوقات، سخت ہیں آلام

تمہاری یاد سے شیریں ہے تلخیٔ ایام

زنداں میں اس المیہ کردار کی کیفیت دیکھئے:

تم آرہے ہو کہ بجتی ہیں میری زنجیریں

نہ جانے کیا مرے دیوار و بام کہتے ہیں

فیضؔ کی شاعری میں نئی صبح کو دیکھ کر ہم محبوب کے عارضوں کے رنگ، اس کی زلف کی چھاؤں، اس کی آنکھوں کے کاجل، اس کی دمکتی ہوئی پیشانی، اس کے لب، اور اس کے پیراہن کو دیکھ لیتے ہیں۔ یہ نئی صبح شام کے اندھیرے میں کسماتی ہے، رات کے اندھیرے سے ابھرنے کی کوشش کرتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ نئی صبح شاعر کے لاشعور میں ہے، حسن اور عشق، محبوب اور نئی صبح یہ سب ایک گہرے جذبے کے مختلف نام ہیں، وہ گہرا جذبہ جس کی مستقل اور عالمگیر صورت غیر شعور میں ہے۔ ظاہر ہے فیضؔ کی نظموں کے ابہام کی یہ ایک بڑی وجہ ہے۔ ایک ذہنی تجربے نے احساس کے جانے کتنے رنگوں کا شعور دیا ہے۔ فیضؔ کے محبوب کا یہ تجریدی تصور بہت کچھ سوچنے پر مجبور کرتا ہے۔ حسن اور عشق اور محبوب کے تصورات کا مطالعہ کرتے ہوئے بہت سی جذباتی کیفیتوں پر نظر جاتی ہے۔ ایک طرف محبوب کے حسن و جمال کا گہرا احساس ہے، دوسری طرف اس المیہ کردار کی تنہائی اور اس کی یاد کے لمحے ہیں، اس کی شخصیت کی ویرانی اور گہرے دکھ درد اور غم کی کیفیتیں ہیں۔ اس کی الجھنیں اور داخلی اندرونی کشمکش اور

تصادم کی باتیں ہیں۔ تاریکی سے نکل کر اجالے میں جانے کی خواہش اور تمنا ہے۔ پورے ماحول کی تاریکی میں ایک سلگتی ہوئی روشنی ملتی ہے۔ ایک کردار کا المیہ پورے معاشرے کا المیہ ہے۔ ایک فرد کا درد ہر فرد کا درد ہے۔ فیضؔ نے مادی اور حسی اشاروں اور علامتوں سے جذباتی کیفیتوں کو اجاگر کرنے کی فنکارانہ کوشش کی ہے۔ ان اشعار کو دیکھئے:

تیرے ہونٹوں کے پھولوں کی چاہت میں ہم
دار کی خشک ٹہنی پہ وارے گئے
تیرے ہاتھوں کی شمعوں کی حسرت میں ہم
نیم تاریک راہوں میں مارے گئے

سولیوں پر ہمارے لبوں سے پرے
تیرے ہونٹوں کی لالی لپکتی رہی
تیری زلفوں کی مستی برستی رہی
تیرے ہاتھوں کی چاندی دمکتی رہی

جب گھلی تیری راہوں میں شامِ ستم
ہم چلے آئے، لائے جہاں تک قدم

لب پہ حرفِ غزل، دل میں قندیلِ غم

اپنا غم تھا گواہی ترے حسن کی

دیکھو قائم رہے اس گواہی پہ ہم۔

ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے

یہ آواز بھی سنیئے:

ایک اک کر کے ہوئے جاتے ہیں تارے روشن

میری منزل کی طرف تیرے قدم آتے ہیں

جب تجھے یاد کر لیا، صبح مہک مہک اٹھی

جب ترا غم جگا لیا، رات مچل مچل گئی

جذباتی کیفیتوں کے ساتھ محبوب کے تصور کی تمام تر معنویت (IMPLICATIONS) پر بھی سوچنا چاہیئے۔ ایسے خیالات کی ہر تہہ کو سمجھنا مشکل نہیں ہے۔ جوشِ بیان نہیں ہے حسنِ بیان ہے۔ اس سے کنایاتی پہلو اجاگر ہوتا ہے۔ تلخی میں شیرینی اور گھلاوٹ ہے۔ شاعری میں خلاقانہ توانائی اسی کو کہتے ہیں۔ اندرونی کرب کی یہ مختلف تصویریں دعوتِ غور و فکر دیتی ہیں۔ یہ بھی غور فرمایئے کہ فیض کے ساتھ ایک پوری روایت سفر کر رہی ہے۔

مختصر نظموں میں "شاہراہ" ایک اہم نظم ہے۔ ایک زندہ کردار ملتا ہے۔ تاثرات گہرے ہیں:

ایک افسردہ شاہراہ ہے دراز
دور اُفق پر نظر جمائے ہوئے
سرد مٹی پہ اپنے سینے کے
سرمگیں حسن کو بچھائے ہوئے
جس طرح کوئی غمزدہ عورت
اپنے ویراں کدے میں محو خیال
وصلِ محبوب کے تصور میں
مو بمو چور، عضو عضو نڈھال

"شاہراہ" ایک زندہ کردار ہے۔ وصلِ محبوب کے تصور میں نڈھال غمزدہ عورت کی تصویر جس طرح اس شاہراہ پر چسپاں کی گئی ہے، وہ قابلِ غور ہے۔ فیض کی ایسی فنکاری اور ہنرمندی بہت متاثر کرتی ہے۔

حساس، جذبہ اور تخئیل کا توازن بھی ہے اور صنم کاری بھی ہے۔ تلمیحوں اور
حقائق کو رومانی فکر کیا بنا دیتی ہے۔ "موضوعِ سخن" میں دیکھیے۔ فیض کا
بنیادی رومانی رجحان اچھی طرح سامنے آتا ہے۔ ان کی مخصوص علامتیں،
اس نظم میں بھی ہیں۔ اس نظم کی بھی اپنی خاص فضا ہے۔ دریچے سے
لمحوں کا تجزیہ کیا جا رہا ہے، لیکن رومانیت مختلف رنگوں میں موجود ہے۔
"زنداں کی ایک شام" میں جو روشنی ہے وہ روح کی روشنی ہے۔ ایسی
مکمل اور دلفریب نظم جدید اردو شاعری میں بہت کم ملتی ہے۔ تخلیقی کرب
کی پہچان بھی مشکل نہیں ہے:

شام کے پیچ و خم ستاروں سے
زینہ زینہ اتر رہی ہے رات
یوں صبا پاس سے گذرتی ہے
جیسے کہہ دی کسی نے پیار کی بات
صحنِ زنداں کے بے وطن اشجار
سرنگوں، محو ہیں بنانے میں
دامنِ آسماں پہ نقش و نگار
شانۂ بام پر دمکتا ہے

مہرباں چاندنی کا زستِ جمیل
خاک میں گھل گئی ہے آبِ نجوم
نور میں گھل گیا ہے عرش کا نیل
سبز گوشوں میں نیلگوں سائے
لہلہاتے ہیں جس طرح دل میں
موجِ دردِ فراقِ یار آئے
دل سے پیہم خیال کہتا ہے
اتنی شیریں ہے زندگی اس پل
ظلم کا زہر گھولنے والے
کامراں ہو سکیں گے آج نہ کل
جلوہ گاہِ وصال کی شمعیں
وہ بجھا بھی چکے اگر تو کیا
چاند کو گل کریں، تو ہم جانیں

اس نظم کی تشبیہوں میں احساسات کے رنگ ملتے ہیں۔ جدید ذہن کی تہہ داری ملتی ہے۔ تجربے کو جذبے کی شدت کے ساتھ جس طرح محسوس کیا گیا ہے اس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ فضا اور تاثر کی وحدت غضب

ں ہے۔ فیضؔ کے لہجے کو سمجھنے میں اس نظم سے بڑی مدد ملتی ہے۔ تلخ حقیقت
عریت کو ختم نہیں کرتی بلکہ شعریت سے تلخ حقیقت آہستہ آہستہ ابھرتی ہے
س نظم کی مرکزیت اور ربط و ضبط اور آہنگ اور ترنم قابلِ مطالعہ ہے۔
"زنداں کی ایک صبح" کی بھی یہی کیفیت ہے۔ تاثرات بہت گہرے
ں۔ رات، چاند، خواب، چاندی کے بھنور، چاند کے ہاتھ، تاروں کے
نول، نیند کی اوس، ان سے کچھ تصورات کو ابھارنے میں مدد لی گئی ہے
نظم کے دوسرے حصے میں متحرک تصورات بہت متاثر کرتے ہیں۔

لذّتِ خواب سے مخمور ہوائیں جاگیں
جیل کی زہر بھری چور صدائیں جاگیں
دور دروازہ کھلا کوئی، کوئی بند ہوا
دور مچلی کوئی زنجیر — مچل کے روئی
دور اترا کسی تالے کے جگر میں خنجر
سر پٹکنے لگا رہ رہ کے دریچہ کوئی

زہر بھری چور صدائیں، مچلتی ہوئی زنجیر، تالے کے جگر میں خنجر کا اترنا،
اور دریچے کا رہ رہ کے سر پٹکنا۔ ان سے زنداں کی فضا ملتی ہے۔ کچھ خاکے
ذہن میں مرتب ہوتے ہیں اور ایک مکمل تصویر بن جاتی ہے۔
"دریچہ" میں صلیب کا استعارہ کتنا بلیغ ہے:

ہر ایک اپنے مسیحا کے خون کا رنگ لئے

ہر ایک وصلِ خداوند کی اُمنگ لئے

کسی پہ کرتے ہیں ابرِ بہار کو قرباں

کسی پہ قتلِ مہِ تابناک کرتے ہیں

کسی پہ ہوتی ہے سرمست شاخسار دو نیم

کسی پہ بادِ صبا کو ہلاک کرتے ہیں

ہر آئے دن یہ خداوندگانِ مہر و جمال

لہو میں غرق مرے غمکدے میں آتے ہیں

اور آئے دن مری نظروں کے سامنے ان کے

شہید جسم سلامت اٹھائے جاتے ہیں

فیض کی شاعری کا المیہ ہیرو صلیب کی علامت سے پورے معاشرے کی ذہنیت اور اس عہد کی کشمکش، تاریکی اور روشنی کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔

"اے روشنیوں کے شہر" میں المیہ ہیرو کی حسرتوں کی دنیا ملتی ہے۔

سبزہ سبزہ سوکھ رہی ہے پھیکی، زرد دوپہر

دیواروں کو چاٹ رہا ہے تنہائی کا زہر

دور افق تک گھٹتی بڑھتی اٹھتی گرتی رہتی ہے

کہر کی صورت بے رونق دردوں کی گدلی لہر

بسا ہوا ہے اس کہر کے پیچھے روشنیوں کا شہر

اے روشنیوں کے شہر

کون کہے کس سمت ہے تیری روشنیوں کی راہ

ہر جانب بے نور کھڑی ہے ہجر کی شہر پناہ

تھک کر ہر سو بیٹھ رہی ہے شوق کی ماند سپاہ

آج مرا دل فکر میں ہے

اے روشنیوں کے شہر

شب خوں سے منہ پھیر نہ جائے ارمانوں کی رو

خیر ہو تیری لیلاؤں کی، ان سب سے کہہ دو

آج کی شب جب دیئے جلائیں، اونچی رکھیں لو

یہ نظم بھی شدید داخلیت کی پیداوار ہے لہجے کا سوز شخصیت کے کرب کو کھیاتا ہے۔ زرد دوپہر، تنہائی کے زہر اور دردوں کی گدلی لہر سے اندرونی ویرانی کا احساس بڑھ جاتا ہے۔ تصورات کے یہ پیکر بہت کچھ سوچنے پر مجبور کرتے ہیں۔ اس نظم کی گہری معنویت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ روشنیوں کا شہر اک: انتہ پیرجد

کے محرومیوں کا شہر ہے۔ اس کی آرزوؤں اور ارمانوں کا شہر ہے۔ زنداں کے دریچے سے یہ دنیا اس طرح نظر آرہی ہے حالانکہ خود اس کردار کی داخلیت اور اس کے لاشعور میں ارد شینوں کا یہ شہر جذب ہے۔

آج کی شب جب دیئے جلائیں، اونچی رکھیں لو

شاعر اپنے سوز اور درد کے ساتھ یہ فیصلہ کر کے یا اس قسم کا مشورہ دے کر مطمئن ہونا چاہتا ہے۔ جذباتی تپش اور کشمکش کی نہایت ہی خوبصورت تصویر ہے۔

"ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے" ایتھل اور جولیس روزبرگ کے المیے سے متاثر ہو کر لکھی گئی ہے۔ درد و الم اور غم انگیزی کے ماحول میں جذباتی بیداری ملتی ہے۔ اس نظم کا علامتی اسلوب فیض کی انفرادیت کا آئینہ ہے۔ تاثرات کا متوازن اظہار ہے۔ داخلی لہر اس خیال کو اجاگر کرتی ہے کہ عمل جاری رہے گا۔ المیہ تصور میں مثبت رجحان بھی موجود ہے:

قتل گاہوں سے چن کر ہمارے علم
اور نکلیں گے عشاق کے قافلے

اس نظم کی بحر میں جو دھمک اور آہنگ ہے وہ بھی قابل غور ہے۔ اس نظم کا تنظیمی حسن اور بنیادی نظریہ دونوں کو متاثر کرتا ہے۔ فیض نے اپنے ایک مضمون "شاعر کی قدریں" میں لکھا ہے:

"جمالیاتی فرحت آپ جب محسوس کریں گے جب حسن کا کوئی مظہر آپ کو متاثر کرے۔ جمالیاتی تاثر بھی آخر تاثر کی ایک صورت

ہے۔ ظاہر ہے کہ اس تاثر میں ایک جذباتی عنصر لازمی ہے لیکن
یہ تاثر جامع اور تسلی بخش جب ہی ہوتا ہے جب اس کے دل اور
دماغ دونوں تسکین اور جلا پائیں۔"

اس نظم میں ایک المیہ کے حسن کا مظہر ہے اور ہم اس سے متاثر ہوتے ہیں
ایک المیہ جانے کتنے المناک واقعات کی علامت ہے۔ ایک المیہ کے حسن کا مظہر
پورے معاشرے کے المیہ واقعات کے حسن کا مظہر بن جاتا ہے۔ جمالیاتی تاثر
موضوع اور بحر، الفاظ اور علامتوں سے پیدا ہوتا ہے۔ شاعر کی جذباتی کیفیت
دل اور دماغ دونوں کو متاثر کرتی ہے۔ میرے کچھ دوستوں کا خیال ہے کہ یہ
فیض کی سب سے عمدہ نظم ہے۔ اس لیے کہ اس میں بڑی معنویت ہے۔ اس
کے تاثرات گہرے ہیں اور یہ جانے کتنے واقعات کو ذہن میں ابھارتے ہیں۔
محمد اسحٰق نے "روداد قفس" میں لکھا ہے:

"...... یہاں زہ مرتے دم تک انسانیت کے مستقبل،
انقلاب یا محبت، ان سب کے ساتھ اپنی وفاداری جتلاتے رہتے
ہیں۔ اس نظم کی آفاقیت (UNIVERSALITY)
عجیب و غریب ہے۔ اس نے صدیوں کو پاٹ کر ہر زمانے اور
ہزاروں میل کی مسافت طے کر کے ہر ملک کے شہیدوں کو ایک
صف میں کھڑا کر دیا ہے۔ یہ نظم کربلا، پلاسی، اسرنگاپٹم، مدکی،
جھانسی، جلیانوالہ، قصہ خوانی، اسٹالن گراڈ، ملایا، کینیا،
کوریا، تلنگانہ، مراکش، تیونس، سبھی سے متعلق معلوم ہوتی ہیں۔
اور طہران، کراچی اور ڈھاکہ کی سڑکوں پہ دم توڑتے ہوئے
طلباء، مراکش، تیونس، کینیا اور ملایا کے خون میں لت پت

مجاہد، سب ایک ہی جانفروز نعرہ دہراتے سنائی دیتے ہیں۔

(زنداں نامہ۔ ص ۴۹ - ۵۰)

موضوع کی تبدیلی کا احساس ہوتا ہے لیکن لب و لہجہ وہی ہے۔ کبھی عنوانات ملتے ہیں لیکن فضا بندی وہی ہے۔ المیہ کردار نے ہمیشہ جذباتی دھندلکوں میں سوچا ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ یہ ایک ہنگامی موضوع ہے لیکن فیض کے ذہن و شعور میں ڈھل کر یہ موضوع کتنا پائیدار بن گیا ہے اس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ ہر بند سے ایک ذہنی اور جذباتی تصویر بنتی ہے۔ مجموعی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ذہنی اور جذباتی سطح بہت ہی تہہ دار ہے۔

میں نے فیض کی ایک مشہور نظم "کتے" کا ذکر ابھی تک جان بوجھ کر نہیں کیا تھا، اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ نظم موضوع کے اعتبار سے ان کی دوسری نظموں سے مختلف ہے۔ یہ ایک طنزیہ نظم ہے۔ ہندوستانی ذہنیت، ہمارے رجحان اور احساس کمتری پر یہ گہرا طنز ہے۔ یہ بھی ایک علامتی نظم ہے یہ ولیم بلیک کی مشہور علامتی نظم A POISON TREE سے مختلف ہے۔ کتے کی علامت سے ذہنی پستی اور ذلت اور بیمار رجحان اور احساس کمتری کو سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ فیض کی کئی نظموں کو پڑھتے ہوئے "کنگ لیئر" کا وہ جملہ یاد آتا ہے۔

IT SMELLS OF MORALITY.

یہاں بھی یہی بات ہے۔ صدیوں کی ذہنی پستی اور صدیوں کے احساسِ کمتری کا یہ بھرپور اعتراف بھی ہے اور یہ احساس بھی ہے:

یہ چاہیں تو دنیا کو اپنا بنا لیں

یہ آقاؤں کی ہڈیاں تک چبا لیں

کوئی اِن کو احساسِ ذلّت دلا دے

کوئی اِن کی سوئی ہوئی دُم ہلا دے

اپنے دور اور اپنے انداز کی منفرد نظم ہے۔ اس نظم میں غیر شعوری کیفیات نہیں ہیں۔ تمثیلی انداز ہے۔ اس نظم کا جوش یا EXCITEMENT بھی متاثر کرتا ہے۔

"صبح آزادی" (اگست ۱۹۴۷ء) بھی فیض کی ایک نمائندہ نظم ہے جس تصورات اور استعارے، داخلی کیفیت اور آہنگ، غنائیت اور سوز و گداز، المیہ کردار کے جذبات اور احساسات ـــ ان باتوں کا مجموعی تاثر بہت گہرا ہوتا ہے۔ صبح کا انتظار یہاں بھی ہے۔ شاعر آزادی کی صبح دیکھ کر مایوس ہو جاتا ہے۔

یہ داغ داغ اجالا، یہ شب گزیدہ سحر

وہ انتظار تھا جس کا، یہ وہ سحر تو نہیں

یہ وہ سحر تو نہیں جس کی آرزو لے کر

چلے تھے یار کہ مل جائے گی کہیں نہ کہیں

فلک کے دشت میں تاروں کی آخری منزل

کہیں تو ہوگا شبِ سست موج کا ساحل

کہیں تو جا کے رکے گا سفینۂ غمِ دل

لیکن وہ آنے والے لمحوں سے مایوس بھی نہیں ہے :

جگر کی آگ ، نظر کی اُمنگ ، دل کی جلن
کسی پہ چارۂ ہجراں کا کچھ اثر ہی نہیں
کہاں سے آئی نگارِ صبا ، کدھر کو گئی
ابھی چراغِ سرِ رہ کو کچھ خبر ہی نہیں
ابھی گرانیٔ شب میں کمی نہیں آئی
نجاتِ دیدہ و دل کی گھڑی نہیں آئی
چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی

"یہ داغ داغ اجالا" سے ذہنی کیفیت سمجھ میں آجاتی ہے ـــــ فیض انقلابی بخار سے دور ہیں، دبی ہوئی چیخ کو محسوس کیا جا سکتا ہے۔ جذبات کا اظہار سلیقے سے ہوا ہے۔ فنکاری موجود ہے۔ داغ داغ اجالا، شب گزیدہ سحر، فلک کے دشت میں تاروں کی منزل، سفینۂ غمِ دل، دیارِ حسن، بے صبر خواب گاہیں، رُخِ سحر، حسینانِ نور کا دامن، سِسک سِسک تمنا، دبی دبی تھکن، اہلِ درد کا دستور، نشاطِ وصل، عذابِ ہجر، جگر کی آگ، دل کی جلن، نظر کی امنگ، گرانیٔ شب۔ فیض نے انفرادی اور اجتماعی جذبات کی وضاحت ان حسی تصورات، استعارات اور تراکیب اور الفاظ کی ہے۔ ان کے چونکے ہوئے احساس پر غور فرمائیے۔

فیضؔ کی غزلوں میں عام ذہنی اور نیم فلسفیانہ سطح نمایاں ہوتی ہے۔ اس عہد کے مزاج کی پہچان ہو جاتی ہے۔ داخلی سچائیاں متاثر کرتی ہیں۔ المیہ کردار کی ذہنی بیداری اور اس عہد کے المیہ تجربوں کو اس عام ذہنی اور فلسفیانہ سطح پر دیکھا جا سکتا ہے۔ احساس کی شدت بھی ہے اور جذبے کا خلوص بھی اس کا فرصت سخن میں فیضؔ اپنے مخصوص لب و لہجے سے پہچانے جاتے ہیں۔ لہجے کا دھیما پن، بیان کا اختصار، آواز کی نرمی، جذبات کی تہذیب، شعور کی گہرائی، ذہنی اور جذباتی ہم آہنگی، داخلی کرب اور بے چینی، خلش اور کسک، پیکر نگاری، رمزیت اور ایمائیت، دروں بینی اور سوز و گداز سب کچھ ہے ایک خواب آلود اور طلسمی ماحول میں بھی ہم داخلی حقیقتوں اور سچائیوں کو پہچان لیتے ہیں۔ فیضؔ کا اسلوب بھی جذباتی ہے لیکن اس جذباتی اسلوب سے ایک انفرادیت ابھرتی ہے۔ فیضؔ نے انفرادیت اور آفاقیت میں ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہ اردو اور فارسی شاعری کی روایات سے متاثر ہیں، قدیم اسلوب اور روایتی تصورات اور علامات کو اپناتے ہوئے انہوں نے نئی معنویت پیدا کی ہے۔ میں نے فیضؔ کے کلام پر تبصرہ کرتے ہوئے بہت پہلے لکھا تھا کہ فیضؔ اردو شاعری میں ایک غنائیت لے کر آئے ہیں جو دراصل مغربی شاعری کی غنائیت ہے۔ ایک طرف سوداؔ اور میرؔ

اور فارسی غزل نگاروں کی روایات سے متاثر ہیں اور دوسری طرف انگریزی شاعری کی غنائیت سے۔ ادبی روایات کو اس طرح جذب کر کے انہوں نے نئی غزل کو ایک داخلی کردار سے روشناس کرایا ہے۔ تغزل اور لیرک کے امتزاج سے لہجہ اور انداز بیان میں انفرادیت پیدا ہو گئی ہے۔ ان کے ذوقِ جمال سے غنائیت اور صورت گری کے فن میں۔ تازگی آئی ہے۔ پرانی علامتوں سے فیض نے بہت فائدہ اٹھایا ہے۔ ان علامتوں سے انہوں نے اندرونی میلانات اور داخلی کیفیات کو اچھی طرح اجاگر کیا ہے۔ فیض روایت پسند ہیں اور ان کی روایت پسندی سے کچھ کلاسیکی روایات آگے بڑھی ہیں اور جدیدیت سے ہم آہنگ ہو گئی ہیں۔

"نقشِ فریادی" کی غزلوں کے کچھ اشعار دیکھئے:

دل کا ہر تار لرزشِ پیہم
جاں کا ہر رشتہ وقفِ سوز و گداز
میری خاموشیوں میں لرزاں ہے
میرے نالوں کی گمشدہ آواز

اپنی تکمیل کر رہا ہوں میں
ورنہ تجھ سے تو مجھ کو پیار نہیں

اک تری دید چھن گئی مجھ سے
ورنہ دنیا میں کیا نہیں باقی

ویراں ہے میکدہ خم و ساغر اداس ہیں
تم کیا گئے کہ روٹھ گئے دن بہار کے

اک فرصتِ گناہ ملی، وہ بھی چار دن
دیکھے ہیں ہم نے حوصلے پروردگار کے

کیا جانے کس کو کس سے ہے اب داد کی طلب
وہ غم جو مرے دل میں ہے تیری نظر میں ہے

مری چشمِ تن آساں کو بصیرت مل گئی جب سے
بہت جانی ہوئی صورت بھی پہچانی نہیں جاتی

"دستِ صبا" کی غزلوں کے یہ اشعار سنئے:

کبھی کبھی یاد میں ابھرتے ہیں نقشِ ماضی مٹے مٹے سے
وہ آزمائش دل و نظر کی وہ قربتیں سی، وہ فاصلے سے
کبھی کبھی آرزو کے صحرا میں آکے رکتے ہیں قافلے سے
وہ ساری باتیں لگاؤ کی سی، وہ سارے عنوان وصال کے سے

بہت گراں ہے یہ عیشِ تنہا، کہیں سبک تر کہیں گوارا

وہ دردِ پنہاں کہ ساری دنیا رفیق تھی جس کے واسطے سے

تم آئے ہو نہ شبِ انتظار گذری ہے

تلاش میں ہے سحر بار بار گذری ہے

جنوں میں جتنی بھی گذری بکار گذری ہے

اگرچہ دل پہ خرابی ہزار گذری ہے

وہ بات سارے فسانے میں جسکا ذکر نہ تھا

وہ بات ان کو بہت ناگوار گذری ہے

چمن پہ غارتِ گلچیں سے جانے کیا گذری

قفس سے آج صبا بیقرار گذری ہے

تمہاری یاد کے جب زخم بھرنے لگتے ہیں

کسی بہانے تمہیں یاد کرنے لگتے ہیں

شفق کی راکھ میں جل بجھ گیا ستارۂ شام
شبِ فراق کے گیسو فضا میں لہرائے
کوئی پکارو کہ اک عمر ہونے آئی ہے
فلک کو قافلۂ روز و شام ٹھہرائے
صبا نے پھر درِ زنداں پہ آکے دی دستک
سحر قریب ہے، دل سے کہو کہ نہ گھبرائے

عجزِ اہلِ ستم کی بات کرو
عشق کے دم قدم کی بات کرو
ہجر کی شب تو کٹ ہی جائے گی
روزِ وصلِ صنم کی بات کرو
جان جائیں گے جاننے والے
فیضؔ، فرہاد و جم کی بات کرو

فکرِ دلداریِ گلزار کروں یا نہ کروں
ذکرِ مرغانِ گرفتار کروں یا نہ کروں

جانے کس رنگ میں تفسیر کریں اہلِ ہوس

مدح زلف و لب و رخسار کروں یا نہ کروں

وہیں ہے دل کے قرائن تمام کہتے ہیں

وہ اک خلش کہ جسے تیرا نام کہتے ہیں

تم آرہے ہو کہ بجتی ہیں میری زنجیریں

نہ جانے کیا مرے دیوار و بام کہتے ہیں

یہی کہ مفت لگا دی ہے خونِ دل کی کشید

گراں ہے اب کے مئے لالہ فام کہتے ہیں

رنگ پیراہن کا، خوشبو زلف لہرانے کا نام

موسمِ گل ہے تمہارے بام پر آنے کا نام

ہم سے کہتے ہیں چمن والے غریبانِ چمن

تم کوئی اچھا سا رکھ لو اپنے ویرانے کا نام

دل میں اب یوں ترے بھولے ہوئے غم آتے ہیں
جیسے بچھڑے ہوئے کعبے میں عنم آتے ہیں

ایک اک کرکے ہوئے جاتے ہیں تارے روشن
میری منزل کی طرف تیرے قدم آتے ہیں

رقصِ مے تیز کرو، ساز کی لے تیز کرو
سوئے مے خانہ سفیرانِ حرم آتے ہیں

اور کچھ دیر نہ گذرے شبِ فرقت سے کہو
دل بھی کم دکھتا ہے، وہ یاد بھی کم آتے ہیں

ہے وہی عارضِ لیلیٰ، وہی شیریں کا دہن
نگہِ شوق گھڑی بھر کو جہاں ٹھہری ہے

وصل کی شب تھی تو کس درجہ سبک گذری تھی
ہجر کی شب ہے تو کیا سخت گراں ٹھہری ہے

دستِ صیاد بھی عاجز ہے، کفِ گلچیں بھی
بوئے گل ٹھہری نہ بلبل کی زباں ٹھہری ہے

آتے آتے یونہی دم بھر کو رکی ہوگی بہار
جاتے جاتے یونہی پل بھر کو خزاں ٹھہری ہے

کس گماں پہ توقع زیادہ رکھتے ہیں
پھر آج کوئے بتاں کا ارادہ رکھتے ہیں

یادِ غزال چشماں، ذکرِ سمن عذاراں
جب چاہا کر لیا ہے کنجِ قفس بہاراں
شاید قریب پہنچی ہے صبحِ وصال ہمدم
موجِ صبا لئے ہے خوشبوئے خوش کناراں

اب احتیاط کی کوئی صورت نہیں رہی
قاتل سے رسم و راہ سوا کر چکے ہیں ہم

زنداں نامہ کے یہ شعر دیکھئے:

تیرے دستِ ستم کا عجز نہیں
دل ہی کافر تھا جس نے آہ نہ کی
کون قاتل بچا ہے شہر میں فیضؔ
جس سے یاروں نے رسم و راہ نہ کی

شمعِ نظر، خیال کے انجم، جگر کے داغ
جتنے چراغ ہیں تیری محفل سے آئے ہیں

اُٹھ کر تو آ گئے ہیں تری بزم سے مگر
کچھ دل ہی جانتا ہے کہ کس دل سے آئے ہیں

ہر اک قدم اجل تھا، ہر اک گام زندگی
ہم گھوم پھر کے کوچۂ قاتل سے آئے ہیں

شامِ فراق اب نہ پوچھ، آئی اور آ کے ٹل گئی
دل تھا کہ پھر بہل گیا، جاں تھی کہ پھر سنبھل گئی

بزمِ خیال میں ترے حسن کی شمع جل گئی
درد کا چاند بجھ گیا، ہجر کی رات ڈھل گئی

جب تجھے یاد کر لیا، صبح مہک مہک اٹھی
جب ترا غم جگا لیا، رات مچل مچل گئی

دل سے تو ہر معاملہ کر کے چلے تھے صاف ہم
کہنے میں ان کے سامنے بات بدل بدل گئی

خیالِ یار، کبھی ذکرِ یار کرتے رہے
اسی متاع پہ، ہم روزگار کرتے رہے
نہیں شکایتِ ہجراں کہ اس وسیلے سے
ہم ان سے رشتۂ دل استوار کرتے رہے
وہ دن کہ کوئی بھی جب وجہِ انتظار نہ تھی
ہم ان میں تیرا سوا انتظار کرتے رہے

کب یاد میں تیرا ساتھ نہیں، کب ہاتھ میں تیرا ہاتھ نہیں
صد شکر کہ اپنی راتوں میں اب ہجر کی کوئی رات نہیں

دل نا امید تو نہیں، ناکام ہی تو ہے
لمبی ہے غم کی شام مگر شام ہی تو ہے
دستِ فلک میں گردشِ تقدیر تو نہیں
دستِ فلک میں گردشِ ایام ہی تو ہے

گلوں میں رنگ بھرے بادِ نوبہار چلے
چلے بھی آؤ کہ گلشن کا کاروبار چلے

قفس اداس ہے یارو صبا سے کچھ تو کہو
کہیں تو بہرِ خدا آج ذکرِ یار چلے

—

ایسے ناداں بھی نہ تھے جاں سے گذرنے والے
ناصحو، پندگرو، راہ گذر تو دیکھو

وہ تو وہ ہے، تمہیں ہو جائے گی الفت مجھ سے
اک نظر تم مرا محبوبِ نظر تو دیکھو

صبح کی طرح جھمکتا ہے شبِ غم کا افق
فیضؔ تابندگیٔ دیدۂ تر تو دیکھو

—

شوق والوں کی حزیں محفلِ شب میں اب بھی
آمدِ صبح کی صورت ترا نام آتا ہے

"دستِ تہِ سنگ" کے کچھ اشعار ملاحظہ ہوں:

جمے گی کیسے بساطِ یاراں کہ شیشہ و جام بجھ گئے ہیں

سجے گی کیسے شبِ نگاراں کہ دل سرِ شام بجھ گئے ہیں

وہ تیرگی ہے رہِ بتاں میں چراغِ رخ ہے نہ شمعِ وعدہ

کرن کوئی آرزو کی لاؤ کہ سب در و بام بجھ گئے ہیں

بہار اب آکے کیا کرے گی کہ جن سے جشنِ رنگ و نغمہ

وہ گل سرِ شاخ جل گئے ہیں وہ دل تہِ دام بجھ گئے ہیں

پیمانِ جنوں ہاتھوں کو شرمائے گا کب تک

دل والو، گریباں کا پتا کیوں نہیں دیتے

دردِ شبِ ہجراں کی جزا کیوں نہیں دیتے

خونِ دلِ وحشی کا صلا کیوں نہیں دیتے

وہ جفائے غم کا چارہ، وہ نجاتِ دل کا عالم

ترا حسن دستِ عیسیٰ، تری یاد روئے مریم

تری دید سے سوا ہے ترے شوق میں بہاراں

وہ زمیں جہاں گری ہے ترے گیسوؤں کی شبنم

ترے غم کو جن کی تلاش تھی ترے جاں نثار چلے گئے
تری رہ میں کرتے تھے سر طلب، سرِ رہگذار چلے گئے

تری کج ادائی سے ہار کے شبِ انتظار چلی گئی
مرے ضبطِ حال سے روٹھ کر مرے غم گسار چلے گئے

نہ سوالِ وصل، نہ عرضِ غم، نہ حکایتیں نہ شکایتیں
ترے عہد میں دلِ زار کے سبھی اختیار چلے گئے

نہ رہا جنونِ رُخِ وفا، یہ رسن یہ دار کرو گے کیا
جنہیں جرمِ عشق پہ ناز تھا وہ گناہ گار چلے گئے

آج یوں موج در موج غم تھم گیا اس طرح غمزدوں کو قرار آگیا
جیسے خوشبوئے زلفِ بہار آگئی جیسے پیغامِ دیدارِ یار آگیا

جس کی دید و طلب وہم سمجھے تھے ہم روبرو پھر سرِ رہگذار آگیا
صبحِ فردا کو پھر دل ترسنے لگا، عمرِ رفتہ ترا اعتبار آگیا

سرفروشی کے انداز بدلے گئے، دعوتِ قتل پر مقتلِ شہر میں
ڈال کر کوئی گردن میں طوق آگیا، لاد کر کوئی کاندھے پہ دار آگیا

یک بیک شورشِ فغاں کی طرح

فصلِ گل آئی امتحاں کی طرح

صحنِ گلشن میں بہرِ مشتاقاں

ہر روش کھنچ گئی کماں کی طرح

پھر لہو سے ہر ایک کاسۂ داغ

پُر ہوا جامِ ارغواں کی طرح

یاد آیا جنونِ گم گشتہ

بے طلب قرضِ دوستاں کی طرح

ہر صدا پر لگے ہیں کان یہاں

دل سنبھالے رہو زباں کی طرح

نہ گنواؤ ناوکِ نیم کش دلِ ریزہ ریزہ گنوا دیا

جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو تنِ داغ داغ لٹا دیا

مرے چارہ گر کو نوید ہو صفِ دشمناں کو خبر کرو

جو وہ قرض رکھتے تھے جان پر وہ حساب آج چکا دیا

کرو کج جبیں پہ سرِ کفن مرے قاتلوں کو گماں نہ ہو

کہ غرورِ عشق کا بانکپن پسِ مرگ ہم نے بھلا دیا

جو رُکے تو کوہِ گراں تھے ہم جو چلے تو جاں سے گذر گئے

رہِ یار ہم نے قدم قدم تجھے یادگار بنا دیا

کسی کا درد ہو کرتے ہیں تیرے نام رقم

گلہ ہے جو بھی کسی سے ترے سبب سے ہے

کہاں گئے شبِ فرقت کے جاگنے والے

ستارۂ سحری ہم کلام کب سے ہے

یار آشنا نہیں کوئی ٹکرائیں کس سے جام

کس دل ربا کے نام پہ خالی سبو کریں

فیض کی غزلوں میں فکر و خیال کی سطح پر جس مزاج کی تشکیل ہوتی ہے اس کی تصویر یہ سامنے ہے۔ اندرونی تپش اور سوز و گداز سے ہم زیادہ متاثر ہوتے ہیں۔ شاعر کے صاف ستھرے اندازِ بیان سے اس حقیقت کا احساس ہوتا ہے کہ اسے تہذیبی وحدت کے ٹوٹ جانے کا گہرا احساس ہے اور وہ

قاری کے ذہن اور جذبات کو اپنے ذہن اور جذبوں سے الگ کرنا نہیں چاہتا۔
وہ چاہتا ہے کہ قاری اس کے تجربوں میں شریک ہو جائے، اس کے احساسات
کو سمجھے۔ فیض نے ادب کی روایات اور علائم سے اتنا گہرا رشتہ اسی لئے قائم کیا
ہے۔ انہیں غزل کے نازک فن کی کیفیت معلوم ہے، خارجی تجربوں کو جذب
کر کے انہیں غزل کے فارم میں تمام نزاکتوں کا خیال رکھتے ہوئے ڈھالنا اس
عہد میں آسان نہیں ہے، اس دور میں جبکہ صاف صاف باتیں کہی جا رہی ہیں،
کنایاتی انداز اختیار کر کے اسے قائم رکھنا بڑی بات ہے۔ ان کی غزلوں میں
دل، جان، خاموشی، نالہ، پیار، دید، میکدہ، ساغر، بہار، خزاں، گناہ،
یاد، آرزو، صحرا، قافلہ، ہجر، وصال، شیخ، ناصح، محتسب، درد، صبح،
شب، انتظار، تلاش، سحر، جنوں، چمن، گلچیں، صبا، زنداں، عشق،
فرہاد، زلف، لب و رخسار، گلشن، دیوار و بام، پیراہن، غم، صنم، کعبہ،
بت خانہ، منزل، عارض لیلیٰ، شوق، دستِ صیاد، کفِ گلچیں، بوئے گل،
بلبل، کوئے بتاں، صبحِ وصال، موجِ صبا، قاتل، کافر، محفل، شامِ فراق،
بزمِ خیالی، خیالِ یار، دستِ فلک، گردشِ ایام، شیشہ و شام، وحشی، حسن،
ضبطِ حال، عرضِ غم، گنہگار، زلفِ بہار، سرفروشی، دعوتِ قتل، طوق، فصلِ
گل، صحنِ گلشن، کماں، لہو، چارہ گر، کفن، غرورِ عشق، ستارہ، سحری، دل رُبا،
دیدۂ تر، دیوار، قفس، بادل، گھٹا، اور اسی قسم کے روایتی الفاظ اور تراکیب
ملتے ہیں لیکن تخلیقی فکر نے ان میں نئی معنویت پیدا کر دی ہے۔ نئے تجربوں
میں یہ الفاظ اپنی نئی چمک دمک رکھتے ہیں۔ ایسے لفظوں اور ایسی ترکیبوں
میں فیض نے نئی فکر کو جذب کیا ہے۔ کچھ اس طرح کہ تغزل کی لطافت بھی
قائم رہے اور ذوقِ جمال کو بھی صدمہ نہ پہنچے۔ اپنی پیکر تراشی کے فن سے

انہوں نے ان لفظوں اور ترکیبوں میں عجیب کیفیت پیدا کر دی ہے ماندرونی میلانات اور جذباتی المیہ رجحان کے لئے ان لفظوں اور ترکیبوں کو پسند کیا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ اس طرح غنائیت اور نغمگی بھی قائم رہتی ہے، اور صورت گری کا آرٹ بھی بالیدہ ہو گیا ہے۔ شبِ وصل اور روزِ ہجر کا ذکر عصری ہیجانات کا ذکر ہے، ناصح، شیخ اور محتسب کے کردار اس عہد کے جیتے جاگتے کردار بن گئے ہیں جنوں کے لفظ سے اس جنوں کا تصور پیدا ہوتا ہے جو حب الوطنی کا بھی جنوں ہے اور عام انسانی قدروں کا جنوں بھی۔ غزلوں میں بھی شام و صبح اور یاد اور انتظار کا ذکر ہے۔ بنیادی جذبے تجربے وہی ہیں جو ان کی نظموں میں ہیں۔ بنیادی المیہ رجحان بھی ہر جگہ موجود ہے، یہاں دروں بینی کا کوئی معجزہ نہیں ہے، یہ صاف ستھرے، سادہ اور عام فہم اشعار ہیں لیکن ہم ان اشعار کی رمزیت اور ایمائیت کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔ وطن کا تصور محبوب کا تصور بن گیا ہے، صبح کی تصویر محبوب کی تصویر بن گئی ہے آنے والے کل کا انتظار محبوب کا انتظار بن گیا ہے۔ ان اشعار کی شعریت، رومانیت اور رمزیت فیض کی فنکارانہ صلاحیتوں کا احساس دلاتی ہے۔ فکر کے جذباتی اور حسیاتی ادراک اور اشاراتی زرخیزی کا مطالعہ کرنا چاہیئے۔ یہ تمام اشعار جدید غزل کے نمائندہ اشعار ہیں اور جدید غزل کا مطالعہ کرتے ہوئے ہم انہیں نظر انداز نہیں کر سکتے۔

فیض کی اکثر غزلوں میں اشعار کا لطیف اور دلکش ربط متاثر کرتا ہے ہر غزل اپنی خاص فضا رکھتی ہے، مختلف تجربوں اور خیالوں سے فضا پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ ہر جگہ ایک جانا پہچانا لہجہ ہے، سوز و گداز کی کیفیتیں ہیں، دروں بینی ہے اور عالمگیر صداقتوں اور سچائیوں کا جذباتی اظہار ہے۔ بہت سے

اشعار تو محاوروں کی طرح استعمال ہونے لگے ہیں۔ اس کی وجہ ان اشعار کی بلاغت اور معنوی ہمہ گیری ہے اسمیں کوئی شبہ نہیں کہ ان اشعار کے پیچھے ایک تربیت یافتہ، متین اور سنجیدہ اور اس عہد کے المیات کو محسوس کرنے والی شخصیت ملتی ہے؛ غزلوں میں ابہام نہیں ہے، ایمائیت ہے اور اگر کہیں ابہام ہے بھی تو وہ معنی خیز ابہام ہے، اسی طرح جس طرح ان کی نظموں میں ہے تخئیل اور مشاہدہ اور جذبہ اور خیال کی ہم آہنگی ہر جگہ ہے.

جب فیضؔ یہ کہتے ہیں:

میری خاموشیوں میں لرزاں ہے　　　میرے نالوں کی گمشدہ آواز

تو خاموشی کا ایک عجیب حسیاتی تصور پیدا ہوتا ہے۔ صورت گری کا یہ داخلی اور حسیاتی معمولی نہیں ہے۔ اس حسیاتی تصور میں اندرونی کسک اور گھٹن ہی سب کچھ ہے۔ یہ شعر:

کیا جانئے کس کو کس سے ہے اب داد کی طلب

وہ غم جو میرے دل میں ہے تیری نظر میں ہے

ایک دلفریب انکشاف ہے۔ ربودگی اور گمشدگی کا احساس بھی ہوتا ہے اور جذبے کی شدت کو محسوس بھی کیا جا سکتا ہے۔ عاشق کا دل اور محبوب کی نظر ایک دوسرے کے لئے آئینہ بن گئے ہیں۔ کہنے کا انداز منفرد ہے۔ یہ شعر تو آپ کو یاد ہی ہوگا:

وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہ تھا　　　وہ بات ان کو بہت ناگوار گذری ہے

یہ بات محبت کی بھی ہے اور اس عہد کے ہیجانات کی بھی۔ محبوب اور عہد کے مزاج کو ایک ساتھ دیکھئے، دونوں کے تیور ایک جیسے ہیں۔ شاعر کی معصومیت بھی قابلِ غور ہے۔ اس معصومیت کے ساتھ ایک ہلکا سا تصور بھی ہے اور ایک گہرا طنز بھی۔ اسی غزل کا یہ شعر دیکھئے:

چمن پہ غارتِ گلچیں سے جانے کیا گذری
قفس سے آج صبا بے قرار گذری ہے

چمن، غارتِ گلچیں، قفس اور صبا کی باتیں ہیں، عام روایتی الفاظ ہیں، لیکن عصری ہیجانات کے پیش نظر اس شعر کی معنویت گہری ہو جاتی ہے، صبا کی بیقراری شاعر کی بیقراری بن گئی ہے، اندیشے بھی پراسرار ہیں، ایک عام احساس ہے جس سے ذہنی افق کی وسعت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ ایمائی اور رمزیہ انداز اس شعر میں دیکھئے۔

صبا نے پھر درِ زنداں پہ آکے دی دستک
سحر قریب ہے، دل سے کہو کہ نہ گھبرائے

ہر شعر میں نئے شعور کی پہچان ہوتی ہے، پرانی علامات کو نئے مفہوم میں برتنے کے اس رجحان نے دو نسلوں کو متاثر کیا ہے۔ جو اشعار میں نے پیش کئے ہیں ان میں علامتی رنگ ہر جگہ ہے، اس علامتی رنگ سے شاعر کے مزاج کی پہچان ہوتی ہے۔ فیض کی بعض غزلوں میں شدید رومانیت ملتی ہے، پھر کی سبک روی اور جذبہ اور الفاظ کی لطافت اور مٹھاس متاثر کرتی ہے۔ ہر جگہ یہی کیفیت ہے

دل کا ہر تار لرزشِ پیہم ۔۔۔ جاں کا ہر رشتہ وقفِ سوز و گداز

اس سلسلہ میں یہ اشعار دیکھئے:

تمہاری یاد کے جب زخم بھرنے لگتے ہیں
کسی بہانے تمہیں یاد کرنے لگتے ہیں

اور کچھ دیر نہ گذرے شبِ فرقت سے کہو
دل بھی کم دکھتا ہے، وہ یاد بھی کم آتے ہیں
اٹھ کر تو آ گئے ہیں تری بزم سے مگر
کچھ دل ہی جانتا ہے کہ کس دل سے آئے ہیں

فیض کا یہ شعر:
کسی کا درد ہو، کرتے ہیں تیرے نام رقم
گلہ ہے جو بھی کسی سے ترے سبب سے ہے

اور اس قسم کے دوسرے اشعار میں محبوب اور ظالم نظام کا پیکر ایک ہو جاتا ہے۔ فیض اردو شاعری کے کلاسیکی لہجے سے بہت متاثر ہیں۔ اس عہد میں کلاسیکی آبرو کو قائم رکھنا مشکل نہیں ہے تو آسان بھی نہیں ہے۔

فیض کی غزلوں میں بھی ہر تصور اور ہر خیال احساس، جذبہ اور حیات میں پگھل کر کسی نہ کسی محسوس شکل میں نمایاں ہو گیا ہے۔ یہ فیض کے رومانی اور جمالیاتی رجحان کی ایک بڑی مثال ہے۔

(ختم شد)

(کتبہ حفیظ صدیقی)